Regd. L. No.7243

Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

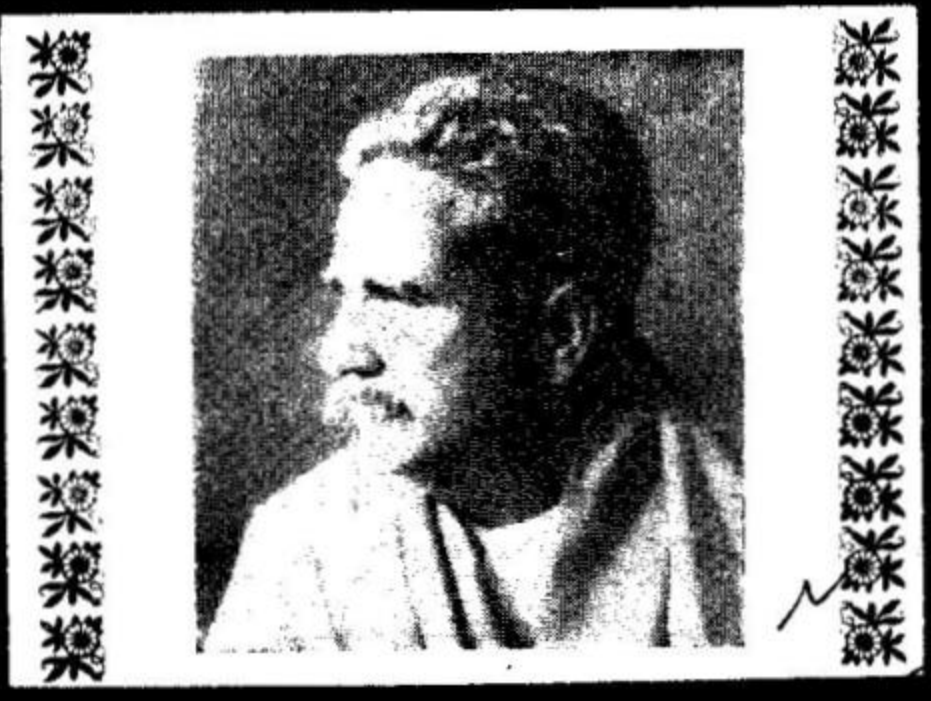

اپریل 1974

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر!

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل اشتراک	ٹیلیفون	قیمت فی پرچہ
پاکستان ــــــ سالانہ ۱۵ روپے	۸۰۸۰۰	(۱/۲ ۱)
غیر ممالک ــــــ سالانہ ۱/۲ ۱ پونڈ	خط و کتابت: بنام ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲، لاہور	ڈیڑھ روپیہ

جلد (۲۷)	اپریل ۱۹۷۴ء	نمبر (۴)

فہرست

(۱) لمعات ــــــ ۲

(۲) سری نگر کشمیر میں ــــــ (جگن ناتھ آزاد) ــــــ ۵

(۳) وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ــــــ (محترم پرویز صاحب) ــــــ ۹

(۴) پاکستان کی نشاۃِ ثانیہ ــــــ (محترم حسن عباس رضوی صاحب) ــــــ ۳۷

(۵) رابطۂ باہمی ــــــ ۴۸

(۶) مسلم سربراہی کانفرنس ــــــ ۴۹

(۷) ایک اور چراغ گل ہوگیا ــــــ ۶۳

ایڈیٹر: محمد خلیل۔ ناشر: سراج الحق۔ مقامِ اشاعت: ۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور۔ پرنٹر: رشید محمد ارشد ... مطبع ...

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

زندہ قومیں اپنے محسنین و مشاہیر کی یادیں مناتی ہیں۔ ان تقاریب سے ان رفتگان کا کچھ نہیں سنورتا۔ نہ ہی ان کی یاد نہ منانے سے ان کا کچھ بگڑتا ہے۔ وہ اس دنیا میں ہوتے ہی نہیں۔ ان تقاریب سے ایک مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ ان مشاہیر نے جو احسان اس قوم پر کیا ہے اس کے لئے جذباتِ تشکر و عقیدت کا اظہار کیا جائے۔ اور دوسرا یہ کہ نئی نسلوں کو اس حقیقت کی یاد دلائی جائے کہ دنیا میں نام اُسی کا زندہ رہتا ہے جو دوسروں کے لئے نفع بخشیوں کے کام سرانجام دے جائے۔ یہ تقریبیں قوموں کی زندگی ملنے کا مقیاس ہوتی ہیں۔

پاکستان کے قابلِ صد فخر محسنین میں علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے اسمائے گرامی سرفہرست آتے ہیں۔ اس مملکت کا وجود انہی کی فکر و عمل کا رہینِ منت ہے۔ کسی قوم پر اس سے بڑا احسان اور کیا ہو سکتا ہے کہ اُسے غیروں کی غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرا کر ایک عظیم الشان مملکت کا وارث بنا دیا جائے۔ احسان شناسی اور سپاس گزاری کا تقاضا تھا کہ ان مشاہیر کی یاد اس طرح منائی جاتی کہ فضاؤں میں اس کی آواز سال بھر تک گونجتی رہتی۔ لیکن جس طرح اس ناشکر گذار قوم نے اس مملکت کی قدر نہ کی، اسی طرح ان محسنین کی شایانِ شان یاد منانے کے فریضہ سے بھی مجرمانہ تغافل برتا۔ موجودہ حکومت نے دو سال اُدھر قائداعظمؒ کی یاد میں، ان کا یومِ پیدائش منانے کی بجائے پیدائش کا ہفتہ منانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن (دیگر مقامات کا تو ہمیں علم نہیں) لاہور میں جس انداز سے یہ ہفتہ منایا گیا، اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہوں نے اُس کے کسی اجلاس میں شرکت کی ہو۔ آرٹس کالج کے عقب میں ایک کمرہ ہے، باقی کمروں کے مقابلے میں ذرا زیادہ وسیع۔ اُس میں فرش سے چھت تک سیڑھیوں کی طرح گیلریاں کھڑی کر دی گئی ہیں۔ تم اس کمرے میں یہ یادگاری ہفتہ منایا جاتا ہے۔ اُس کا انداز یہ ہوتا ہے کہ مقالہ نگار (گویا) بیگار بھگتنے کے لئے مائیک کے سامنے کھڑا ہے۔ کرسی نشین حضرات اونگھ رہے ہیں اور سامنے سیڑھیوں پر کچھ کھلنڈرے قسم کے طالب علم مونگ پھلیاں کھا رہے ہیں۔ ان اجتماعات میں موضوعات کس قسم کے ہوتے ہیں، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ۱۹۷۳ء کے اس سیمینار کے آخری اجلاس میں موضوع تھا ــــ "سیلاب کے بعد کی تدابیری مشکلات"۔

دوسری تقریب یومِ اقبالؒ کی ہوتی ہے۔ اسے مختلف مجالس اور سوسائٹیاں جنہیں حکومت کی طرف سے گرانٹ ملتی ہے، اس طرح مناتی ہیں جس طرح مزاروں کے متولی محکمہ اوقاف سے "نذرانہ"

وصول کرنے کے لئے عرس مناتے ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں بھارت کی حکومت نے فیصلہ کیا کہ علامہ اقبال کا صد سالہ جشن سال بھر منایا جائے۔ آپ سوچئے کہ کہاں علامہ اقبالؒ اور کہاں بھارت کی حکومت۔ لیکن جس طرح انہوں نے چند سال پہلے غالب کا صد سالہ جشن منا کر دنیا میں اپنی اردو دوستی اور مسلم نوازی کا ڈنکا بجایا تھا اسی طرح انہوں نے سوچا کہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کے شاعر "اقبالؒ" کا جشن منا کر انہیں وطنیت پرست ثابت کیا جائے۔ نیت ان کی کچھ بھی ہو، بہرحال ان کے تدبر اور دور اندیشی کی داد دینی پڑتی ہے جس طرح غالب کے صد سالہ جشن کی آواز سن کر یہاں کی بعض ادبی سوسائٹیوں نے اسی قسم کا جشن منانے کا ڈھول پیٹا تھا (بالخصوص اس لئے کہ وہ جشن یونیسکو کے زیر سرپرستی منائے گئے تھے) اسی طرح اب جو ہندوستان سے اقبال کے صد سالہ جشن کی آواز بلند ہوئی تو یہ بھی آنکھیں ملتے ہوئے جاگے اور "سال بھر جشن منانے" کے اعلانات ہونے شروع ہو گئے۔ اس ضمن میں ایک آدھ تقریب بھی منعقد ہوئی کہ اتنے میں کسی نے کہا کہ بھلے لوگو! اقبالؒ کی پیدائش تو ۱۸۷۷ء میں ہوئی تھی اور آپ لوگ ۱۹۷۳ء ہی میں ان کی پیدائش کے سو سال پورے کر بیٹھے۔ دانشوروں نے سر ہلایا کہ یہ بات واقعی تحقیق طلب ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ اس تحقیق کا آغاز تو بہت پہلے ہو چکا ہے جنوری ۱۹۷۳ء میں حکومت نے یہ تحقیق کرنے کے لئے ایک کمیٹی نامزد کی تھی کہ علامہ اقبال کی صحیح تاریخ پیدائش کونسی ہے۔ سال بھر وہ کمیٹی کیا کرتی رہی، کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ لیکن یہ شور سن کر انہوں نے اعلان کر دیا کہ ہماری تحقیق کی رو سے حضرت علامہؒ کی تاریخ پیدائش ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء ہے۔ جب اس تحقیق امین پر سے پردہ اٹھا تو نظر آیا کہ علامہ کی صحیح تاریخ پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہے۔ یہ سن کر جشن منانے والے حضرات نے سکھ کا سانس لیا اور یہ کہہ کر پھر لمبی تان کر سو گئے کہ ابھی صبح صادق میں کافی وقت ہے لب دیکھئے ۱۹۷۷ء میں یہ جشن کس طرح منایا جاتا ہے۔ فی الحال تو یہ "بلا" ان کے سر سے ٹل گئی ہے۔

ہمیں بار بار بھارت کا نام لیتے ہوئے بڑی کوفت اور ندامت ہوتی ہے لیکن کیا کیا جائے کہ یہ نام لینا ہی پڑتا ہے۔ انہوں نے اس جشن کا جو پروگرام مرتب کیا اس کی پہلی کڑی یہ تھی کہ کشمیر کے جس گاؤں میں علامہ اقبال کے آبا و اجداد رہا کرتے تھے وہاں علامہ کی ایک مستقل یادگار تعمیر کی جائے۔ جو مختلف ممالک سے آنے والے سیاحوں کی زیارت گاہ قرار پائے۔ اس سلسلے کی اگلی کڑی یہ تھی کہ سری نگر میں نوادرات اقبال پر مشتمل ایک نمائش منعقد کی جائے۔ یہ فریضہ مشہور شاعر جگن ناتھ صاحب آزاد کے سپرد ہوا (جن کے نام سے کم از کم اہل لاہور بخوبی آشنا ہیں کیونکہ وہ یہیں کی ادبی محافل کو چھوڑ کر ہندوستان کی طرف منتقل ہوئے تھے) انہوں نے اس نمائش کی ترتیب و تشکیل کے سلسلے میں کس قسم کی دشت پیمائیاں اور خارہ شگافیاں کیں اس کا اندازہ اُن کے اُس استقبالیہ سے کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے اس نمائش کے افتتاح پر پیش کیا تھا اور جسے ہم چند صفحات آگے چل کر قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ اُس نمائش کے بعد ہندوستان کے مختلف شہروں میں جس انداز سے تقاریب منعقد ہوئیں ان میں سے بھی بعض کی روئیداد جناب آزاد نے اپنے ہاں

کے اخبارات میں شائع کی ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان میں یہ تقاریب اس شان و شوکت سے کیوں منائی جاتی ہیں اور ہمارے ہاں ان کی حیثیت کاغذ کے پھولوں کی سی کیوں ہوتی ہے۔ جواب بالکل واضح ہے۔ ان کے سامنے ایک مقصد ہے جس کے حصول کے لئے وہ سب کچھ کرتے ہیں۔ ہمارے سامنے کوئی مقصد نہیں اس لئے یوم اقبال یا یوم قائداعظم ہی نہیں ہمارے ہاں کی کسی تقریب یا کسی اجتماع میں کبھی روح نظر نہیں آتی۔ یہ جسد بے جان ہوتے ہیں جنہیں ہمیں مجبوراً اپنے کندھوں پر اٹھانا اور ساتھ ساتھ کلمۂ شہادت پڑھنا پڑتا ہے۔ نصب العین ہمارے سامنے ایک ہی تھا یعنی نظریۂ پاکستان جسے اقبال نے دو مصرعوں میں یوں سمٹا دیا تھا کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اور جس کے متعلق قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ "ہماری آزادی اور پابندی کی حدود خدا کی کتاب متعین کرتی ہے"۔ اس نصب العین کو ہم نے گہرا گڑھا کھود کر دبا دیا اور یوں اس کی حیثیت ایک مقدس مزار کی سی رہ گئی۔ یوم پاکستان۔ یوم آزادی۔ یوم قائداعظم یا یوم اقبال وغیرہ تقاریب اس مزار پر منعقد کئے جانے والے عرس ہیں۔ ان تقاریب کا انتظام کرنے والوں کی کیفیت، محکمہ اوقاف کے ان افسروں کی سی ہوتی ہے جو عقیدۃً خواہ دہریئے ہی کیوں نہ ہوں، انہیں بزرگوں کے مزاروں پر چادریں بھی چڑھانی اور ختم شریف میں شرکت کرنی پڑتی ہے۔ جب صورت یہ ہو تو ان تقاریب میں صداقت کہاں سے آئے گی اور حرارت کیسے پیدا ہوگی؟

(۰)

اس دفعہ اپریل کا مہینہ اپنے جلو میں قران السعدین لئے آرہا ہے۔ اس میں سب سے پہلے وہ سعادت وجہ نورانیت کائنات ہو رہی ہے جس سے بڑی سعادت دنیا میں کوئی اور نہیں (یعنی جشن عید میلاد النبی علیہ التحیۃ والسلام)۔ پرویز صاحب کی طبیعت اواخر فروری سے ناساز چلی آرہی ہے اور وہ اس وقت بھی صاحب فراش ہیں۔ لیکن انہوں نے اس حالت میں بھی اپنا نذرانۂ عقیدت طلوع اسلام میں اشاعت کے لئے مرتب فرما دیا ہے جو پیش خدمت قارئین ہے۔ خدا کرے کہ اس جشن کے انعقاد کے وقت تک وہ اس قابل ہو جائیں کہ اس نذرانہ کو بدرگاہ حضور رسالتمآب اپنی زبان سے بھی پیش کر سکیں۔ یہ ان کی زندگی کی انتہائی آرزو ہوتی ہے۔

دوسری سعادت، یوم اقبال کی تقریب ہے۔ طلوع اسلام کو فکر اقبال سے جو تعلق ہے اس کے پیش نظر ہم اس تقریب کو اپنی بساط کے مطابق حسین و سادہ انداز سے منایا کرتے ہیں۔ امسال بھی ایسا ہی ارادہ ہے۔ وبیدہ التوفیق!

(۰۰۰)

سری نگر (کشمیر) میں

علامہ اقبالؒ کی تصنیفات کی نمائش

(جگن ناتھ آزاد - نئی دہلی)

[سالِ گزشتہ، بھارت کی حکومت نے، علامہ اقبالؒ کی صد سالہ برسی منانے کا فیصلہ کیا۔ اس پروگرام کی ایک کڑی یہ بھی تھی کہ علامہ اقبالؒ کے آبائی گاؤں ——— سوپر (مقبوضہ کشمیر) میں ان کے شایانِ شان یادگار قائم کی جائے اور سرینگر میں ایک نمائش منعقد کی جائے جس میں علامہ سے متعلق نوادرات کو نہایت حسین و جمیل انداز سے پیش کیا جائے۔ اس نمائش کی ترتیب و تشکیل کا فریضہ مشہور شاعر اور ادیب، جگن ناتھ آزاد کے سپرد تھا۔ نمائش ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو منعقد ہوئی جس کا افتتاح بھارتی وزیر اطلاعات و نشریات، مسٹر گجرال نے کیا اور جس کی روئداد آل انڈیا ریڈیو نے نشر کی۔ اس تقریب میں محترم آزاد نے بتایا کہ وہ کس قدر خارہ خشگانی اور کوہ کنی کے بعد اس جوئے شیر کے لانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ داستان (جسے ہم جریدہ شہاب کے شکریہ کے ساتھ شائع کر رہے ہیں) جہاں بے حد دلچسپ ہے وہاں ہمارے لئے سبق آموز اور عبرت انگیز بھی ہے ——— اور اگر جراتِ عرض معاف کی جائے تو ——— ندامت آور بھی۔

طلوعِ اسلام]

سری نگر میں اقبال نمائش منعقد کرنے کا خیال سب سے پہلے ڈاکٹر محمد حسن، صدر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی کے دل میں آیا۔ ہوا یوں کہ جب سالِ رواں کے شروع میں کشمیر یونیورسٹی نے ہفتہ اقبال منانے کا پروگرام بنایا تو ڈاکٹر محمد حسن نے اقبال نمائش کو بھی ایک جزو کے طور پر تقریروں اور مقالات کے علاوہ اس میں شامل کیا۔ اور اس سلسلے میں انہوں نے میرے ساتھ بات کی۔ میں نے اس تجویز کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ جہاں پروگرام کے باقی حصے ایسے ہیں جن پر زیادہ محنت کرنے کی ضرورت نہیں وہاں نمائش ایک ایسا کام ہے جس کے لئے چند دنوں کی نہیں بلکہ کئی مہینوں کی محنت درکار ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ میرے پاس اقبال کی تصویروں اور تحریروں کا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ لیکن غالباً وہ اس خیال سے خالی الذہن تھے کہ یہ تمام تصویریں اور تحریریں موجودہ صورت میں اس ادبی کارنامے کے شایانِ شان نہیں ہیں جسے ہم اقبال نمائش کے نام سے پیش کر سکیں۔ ان تصویروں اور تحریروں کو بڑے سائز میں بنانا، ان پر مناسب عنوانات جلی قلم سے لکھوانا، انہیں ماؤنٹ کر کے الگ الگ پینل پر

سمجھا۔ ایک محنت طلب اور وقت طلب کام تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ میرے ذخیرے کا ایک خاصا حصہ دہلی سے میری غیر حاضری کے باعث دیمک کی نظر ہو چکا تھا، اس لئے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ملک کے مختلف حصوں سے ان تصویروں کو حاصل کرنے کی کوشش ضروری تھی۔ تب کہیں جا کے ٹوٹی ہوئی کڑیاں جڑ سکی تھیں اور ہم ایک تاریخ وار صورت میں حیاتِ اقبال کے مختلف گوشے اہلِ نظر کی خدمت میں پیش کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن نے یہ ساری صورتِ حال کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر خواجہ نور الدین (مرحوم) کے سامنے رکھی۔ انہوں نے حکومتِ ہند کے وزیرِ اطلاعات و نشریات جناب اندر شمار گجرال سے بات کی۔ گجرال صاحب نے انور جمال صاحب قدوائی سے مشورہ کیا اور یہ طے پایا کہ میں اس نمائش کا ایک مختصر سا خاکہ بنا کے پیش کر دوں۔

اس خاکے کی موجودگی میں قدوائی صاحب کے ساتھ مفصل بحث ہوئی۔ انہوں نے خاصے گراں قدر مشورے اس سلسلے میں مجھے دیئے اور فرمایا کہ اقبال کے اشعار کی مصوری والا حصہ عبد الرحمٰن چغتائی کی نمائندگی کے بغیر نامکمل رہیگا۔ چنانچہ میں نے نقشِ اقبال کی تلاش شروع کی۔ لیکن بدقسمتی سے ان تین تصویروں کے علاوہ جو اس نمائش میں شامل تھیں، اور کچھ نہ مل سکا۔

اقبال صدی تقاریب، حیدر آباد

انہی دنوں مجھے حیدر آباد میں اقبال صدی تقاریب میں شرکت کا موقع ملا۔ یہ تقاریب اقبال اکیڈیمی حیدر آباد کے زیرِ اہتمام منائی گئیں اور اقبالیات کی نمائش ان تقاریب کا ایک خاص جزو تھا۔ میں یہ نمائش دیکھ کر بیحد متاثر ہوا۔ اقبال پر لکھی ہوئی کتابوں کا ایک نادر ذخیرہ اس نمائش میں ہر خاص و عام کو دعوتِ نظر دے رہا تھا۔ تصاویر بھی خاصی تعداد میں موجود تھیں۔ لیکن یہ تصاویر اقبال کی زندگی کو تاریخ وار پیش نہیں کر رہی تھیں۔ اکثر اہم کڑیاں اس سلسلے میں نمایاں نہیں۔ اقبال کے خطوط بھی تھے لیکن زیادہ تر وہی جو انہوں نے حیدر آباد کے ادبار اور اہلِ قلم کو لکھے تھے۔ کوئی چالیس کے قریب اقبال کے اشعار بھی مصوری کی صورت میں موجود تھے اور یہ سب تصویریں حیدر آباد کے مصوروں کی بنائی ہوئی تھیں۔ میں نے اس ذخیرے میں سے بھی بعض نوادر سری نگر کی اقبال نمائش کے لئے منتخب کئے جو سید خلیل اللہ صاحب حسنی پرنسپل انوار العلوم کالج حیدر آباد اور برادر محترم عابد علی خان مدیرِ "سیاست" حیدر آباد کی عنایت سے فوراً مجھے حاصل ہو گئے۔ چنانچہ ان نوادر کی بدولت میں نے کشمیر یونیورسٹی کی اقبال نمائش میں ایک گوشہ "حیدر آباد میں اقبال نمائش" کے نام سے شامل کر لیا اور یہ شعبہ آج ہماری اقبال نمائش کا ایک اہم شعبہ ہے۔

عبد الرشید عمادی صاحب کے نام علامہ اقبال کے مکتوب کا نیگیٹو مجھے جناب عابد علی خان کے فرزند عزیز محترم زاہد علی خاں نے عنایت کیا لیکن بدقسمتی سے وہ کہیں ادھر ادھر ہو گیا اور اصل خط سے دوبارہ اس کا نیگیٹو تیار کرانا پڑا۔

یہاں شری وامن راؤ ڈائریکٹر انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ، آندھرا پردیش کا شکریہ ادا کرنا صریحاً احسان فراموشی ہوگی جن کی توجہ سے مذکورہ نادر تصویروں اور تحریروں کے نیگیٹو مجھے آسانی سے حاصل ہو گئے۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہیں!

علی گڑھ، پٹنہ، رامپور

انعقادِ نمائش کا شوق حیدرآباد سے مجھے پٹنے لے گیا جہاں ڈاکٹر عابد رضا بیدار کی بدولت میں نے خدابخش لائبریری کے نوادر سے پوری طرح فائدہ اٹھایا۔ جناب ایم۔ این۔ عماد ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز ڈیپارٹمنٹ حکومت بہار نے مجھ پر خاص کرم فرمائی کی اور مطلوبہ نوادر کے نیگیٹیو بہت کم وقت میں بنوا کے مجھے دے دیئے۔ میں عماد صاحب کی اس عنایت کے لئے ان کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔

پٹنے سے میں لکھنؤ آیا۔ خیال تھا یونیورسٹی سے میں بہت کچھ حاصل کر سکوں گا۔ لیکن وہاں پہنچتے ہی مجھے معلوم ہوا کہ لکھنؤ یونیورسٹی میں فساد ہو گیا ہے اور یونیورسٹی کی اکثر عمارتوں سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ میں ایک آدھ دن لکھنؤ میں رکا مگر یونیورسٹی تک رسائی نہ ہو سکی۔ چنانچہ میں وہاں سے خالی ہاتھ واپس لوٹا۔

اس سفر میں میری اگلی منزل علی گڑھ یونیورسٹی تھی۔ وہاں پروفیسر آل احمد سرور اور رضوی صاحب کی عنایت سے ہفتوں کا کام دنوں میں مکمل ہو گیا۔ یہی لطف و کرم مولانا امتیاز علی عرشی اور ان کے فرزند عرشی زادہ کی طرف سے رضا لائبریری رامپور میں میرا منتظر تھا۔ ان تمام حضرات کے بارے میں جن کی توجہ میری مشکل کو آسان بناتی چلی گئی میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ سچ ــــ کرم کردی الٰہی زندہ باشی!

مسجد قرطبہ

میری ناقص رائے میں "مسجد قرطبہ" صرف اقبال ہی کی عظیم ترین نظم نہیں ہے بلکہ ہماری ساری اردو شاعری میں اس وقت عظیم ترین شہ پارہ ہے۔ اس نظم کو نمائش میں پیش کرنا میں بہت ضروری سمجھتا ہوں۔ چنانچہ اپنے کاغذوں میں اس مسجد کے بارے میں وہ مواد تلاش کرنا شروع کیا جو ۱۹۶۲ء میں اس مسجد کی زیارت کے بعد ہسپانیہ سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ خوش قسمتی سے ان کاغذات میں مجھے توریس بلباس کی تصنیف (L.A MEZQUITE DE CORDOBA) دستیاب ہو گئی۔ مسجد قرطبہ کی تصویروں سے مزین یہ کتاب فوٹوگرافی کے ان نادر نمونوں پر مشتمل ہے جو تصویر کشی کے فن میں شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے نیگیٹیو مجھے میرے دوست جناب پی۔ این۔ بقایا ڈائریکٹر انفرمیشن حکومت جموں و کشمیر نے بنوا دیئے جن کی بدولت میرے بنائے ہوئے خاکے میں رنگ آمیزی کا کام مکمل ہو گیا۔ بقایا صاحب کا شکریہ ادا کئے بغیر میری یہ تحریر یقیناً نامکمل رہتی۔

اقبال کی یہ تمام تصویریں اور اردو انگریزی تحریریں جو دنیائے ادب میں جاودانی مقام رکھتی ہیں، دہلی میں میرے عزیز دوست جناب وی۔ این۔ کھوسلہ کی زیرنگرانی اس صورت میں ظہور پذیر ہوئیں، جس صورت میں آج ناظرین انہیں نمائش میں دیکھ رہے ہیں۔ اس سلسلے میں میرے محترم دوست جناب کے۔ کے۔ نائر کا مشورہ اور رہنمائی جو ملیالم اور انگریزی ادب میں کرشنا چیتنیہ کے نام سے مشہور ہیں

قدم قدم پر حاصل رہی۔ کے۔ کے ناگ اور وی۔ این ککڑ کی اس توجہ کے لئے ان دونوں کا سپاس گزار ہوں۔

فنِ لطیف کوئی بھی ہو ناتمام ہے

ابھی یہ نمائش تکمیل کی منزلوں میں تھی کہ میری درخواست پر دہلی یونیورسٹی کے بعض اردو اساتذہ جن میں ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر عبدالحق اور ڈاکٹر فضل الحق کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، میری اس کوشش کو جسے میں کوشش ناکام کے سوا اور کوئی نام نہیں دے سکتا، ایک نظر دیکھنے کے لئے آئے۔ مجھے مسرت ہے کہ انہوں نے میری کاوش کو بنظرِ تحسین دیکھا اور مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ ان احباب کی فرمائش کہ یہ نمائش چند روز کے لئے دہلی یونیورسٹی میں بھی منتقل کی جائے میرے لئے فخر و مسرت کا باعث ہے۔

ماہرِ غالبیات مالک رام، عابد علی خان مدیر سیاست حیدرآباد، شہباز حسین ڈائریکٹر ترقی اردو بورڈ، غلام رسول سنتوش، ڈاکٹر گیان چند صدر شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی جموں، کے۔ کے۔ کھلر، سید حامد جائنٹ سیکرٹری وزارتِ داخلہ، سید مظفر حسن برنی، ایڈیشنل منسٹری آف پٹرولیم اینڈ کیمیکلز، قرۃ العین حیدر، بیگم حامدہ حبیب اللہ اور سبحان صاحب سابق نمائندہ ٹائمز آف انڈیا کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے ایڈیٹنگ روم میں اس نمائش کو دیکھا۔ ان تمام کرم فرماؤں کے گراں قدر مشورے اس نمائش کی قدر و قیمت میں اضافے کا باعث ہوئے۔

مذکورہ بالا تمام حضرات کی عنایات کا نتیجہ اقبال نمائش سری نگر کی صورت میں اہلِ ملک کے سامنے ہے۔ میں خوش ہوں کہ ڈاکٹر محمد حسن کی خواہش اور میری محنت بار آور ہوئی۔

ڈاکٹر محمد حسن کے کشمیر یونیورسٹی سے طویل چھٹی پر چلے جانے کے بعد ان کے جانشین ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کا تعاون مجھے قدم قدم پر حاصل رہا۔ سری نگر میں اس نمائش کو عملی صورت دینے کے لئے ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے اہم مشورے دیئے۔ دراصل ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کے گراں بہا مشورے مجھے اس وقت بھی حاصل تھے جب میں اس نمائش کی (MASTER COPY) مرتب کر رہا تھا اور اب سری نگر میں ۲۷ راکتوبر کو اس نمائش کے انعقاد کے لئے انہوں نے ہر طرح کی ذمہ داری سنبھال کر میرے کام کو بہت آسان بنا دیا ہے۔

یہ نمائش غالباً ملک کے دوسرے حصوں میں بھی جائے گی۔ مثلاً پروفیسر آل احمد سرور نے علیگڑھ میں، سردار جعفری نے بمبئی میں، بیگم حامدہ حبیب اللہ نے لکھنؤ میں، ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے پٹنے میں اور جناب عابد علی خان نے اسے حیدرآباد میں منعقد کرنے کا خیال ظاہر کیا ہے۔ اس سلسلے میں میری گزارش یہ ہے کہ ملک کے طول و عرض میں جو حضرات اس نمائش کو دیکھیں وہ ازراہِ کرم اپنے تاثرات سے مجھے مطلع فرمائیں تاکہ صرف یہی نہیں کہ اپنی خامیوں سے مجھے آگاہی ہو سکے بلکہ ان تاثرات اور مشوروں کی روشنی میں اس نمائش میں مزید اضافے کئے جا سکیں۔ سو سچ تو علامہ اقبال کے الفاظ میں مجھے اپنی ناچیز کوشش کے بارے میں یہی کہنا ہے۔

تمام مضمون مرے پرانے، کلام میرا خطا سراپا!
ہنر کوئی دیکھتا ہے مجھ میں تو عیب ہے میرے عیب جو کا

(باقی صفحہ [illegible] پر)

باسمہٖ تعالیٰ

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دیں
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دیں

رفعنا لک ذکرک

(اے رسول! ہم تیرے ذکر کو بلند کر دینگے)

عیدِ میلاد النبیؐ کی مبارک تقریب منعقدہ اپریل ۱۹۷۷ء پر

پرویز صاحب کا

بصیرت افروز اور دل گداز خطاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ

آؤ پھر فصلِ بہاراں کا کریں کچھ تذکرہ
کچھ خیابان و گل و گلزار کی باتیں کریں

عزیزانِ گرامی قدر! السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔

ہم اپنی اس خوش نصیبی پر جس قدر بھی نازاں ہوں کم ہے کہ ہمیں ایک بار پھر اس محفلِ حیات آور میں شرکت کی سعادت میسر آئی ہے جس میں اُس ذاتِ اقدس واطہر ؐ کا تذکرہ جمیلہ وجہِ نشاطِ روح اور موجبِ بہجتِ فکر و نظر ہوتا ہے جس کا ظہورِ قدسی عالمِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ کی دلیل ہے۔ یوں تو حضور نبی اکرم ؐ کا تذکارِ جلیلہ، قلبِ مومن کی دھڑکن میں پیوست اور اس کے تنفس میں محلول ہے، اور اس طرح (اقبال کے الفاظ میں)

دشت میں، دامنِ کہسار میں، میدان میں ہے ٭ بحر میں، موج کی آغوش میں طوفان میں ہے
چین کے شہر، مراکش کے بیابان میں ہے ٭ اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے

اس لئے یہ نہ کسی مقام کا پابند ہے نہ زمان کا محتاج، لیکن یہ جو طرح ڈالی گئی ہے کہ سال میں کم از کم ایک دن ایسا مقرر کر لیا جائے جس میں یہ اسمِ گرامی، ساری دنیا کی فضاؤں میں بیک وقت گونج اٹھے، اس نسبت سے یہ تقریب جو سال کے بعد آتی ہے، اور جسے جشنِ عید میلاد النبی کہہ کر پکارا جاتا ہے، اپنے اندر ہزار سامانِ نور و نکہت رکھتی ہے۔ اس کی آمد و رفت کی کیفیت یہ ہے کہ

رفت از شہر آں سا کہ بہاراں زچمن		آمد آں گونہ کہ در باغ صبا می آید

اس دفعہ اِس محفلِ عطر بیز و عنبر فشاں میں میری نذرِ عقیدت کا عنوان علامہ اقبال ؒ کا وہ عمیق و دقیع، اور اس کے ساتھ ہی حسین و جمیل قطعہ ہے جس سے نگاہوں میں چمک، ذہنوں میں جِلا اور دلوں میں سرور پیدا ہو جاتا ہے، اور اظہارِ حقیقت اور اعجازِ بیان کے لحاظ سے جس سے بہتر اور بلند پیشکش، کم از کم میری نظروں سے نہیں گزری۔ انہوں نے کہا ہے۔ اور دیکھئے کس وجد و کیف کے عالم میں کہا ہے کہ

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو		آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفےٰ او را بہا است		یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ است۔

کائنات میں نہیں جو گوشہ بھی ایسا نظر آئے جس میں بہارِ نو انگڑائیاں لے کر ابھر رہی اور حسین آرزوئیں آنکھیں

ملتی بیدار ہو رہی ہوں تو سمجھ لیجئے کہ اس نے یا تو جمالِ مصطفوی سے اکتسابِ ضیا کر لیا ہے اور یا ابھی اس کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اس لئے کہ یہ حقیقت ہے کہ

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو　　چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو　　بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ
وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (۳۳/۵۶)

اقبال کا پیغام بہ حیثیتِ مجموعی قرآن کریم ہی کے کسی نہ کسی گوشے کی تعبیر و تفسیر ہوتا ہے۔ انہوں نے جو کچھ اپنے اس حسین و رنگین قطعہ میں کہا ہے وہ بھی اسی ارشادِ ربانی کی تشریح ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ
كُلِّهِ ۚ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ۔ (۹/۳۳)

خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ ہدایت اور نظامِ حیات دے کر بھیجا جو یکسر حق و صداقت پر مبنی ہے۔ یہ نظام انسانوں کے خود ساختہ تمام نظاموں پر غالب آ کر رہے گا۔ خواہ یہ چیز ان لوگوں کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے جو خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت نہیں کرنا چاہتے۔

اس آیۂ جلیلہ میں کہا گیا ہے کہ خدا نے اپنے رسول کو ایک ایسا دین دے کر بھیجا ہے جس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ رفتہ رفتہ تمام ادیانِ عالم پر غالب آ کر رہے۔ دین، نظامِ زندگی اور ضابطۂ حیات کو کہتے ہیں۔ یہ دین حضرات انبیاء کرام کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتا تھا۔ لیکن ان کے بعد ان کے نام لیوا، یعنی مذہبی پیشوا اس میں اپنے خیالات و نظریات کی آمیزش کر دیتے تھے جس سے وہ دین، چند بے معنی عقاید کا مجموعہ اور بے جان رسوم و مناسک کا مجسمہ بن کر رہ جاتا تھا اسے مذہب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ظہورِ نبویؐ کے زمانے میں، وہ دین جو انبیاءؑ سابقہ کی وساطت سے مختلف اقوامِ عالم کو ملا تھا، مذاہب کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ قرآن کریم نے اسے پھر دینِ خالص کی شکل میں عطا کر دیا اور اسے ہر لحاظ سے مکمل بھی کر دیا۔ یہ وہ دین یعنی نظامِ حیات تھا کہ اس نے جس طرف بھی رُخ کیا، انسانوں کے خود ساختہ ہر نظام پر غالب آتا چلا گیا۔ اس کے بعد اس کے متبعین، یعنی اپنے آپ کو اس کی طرف منسوب کرنے والوں نے اسے رفتہ رفتہ مذہب میں تبدیل کر دیا۔ اور اس طرح یہ دین بھی مذاہب کی سطح پر آ گیا۔ اس کے بعد ہمارے مناظر دیگر اہلِ مذاہب کو چیلنج دینے لگ گئے کہ ہمارا مذہب تمہارے مذہب سے افضل ہے۔ اوّل تو مناظرے فیصلہ کن مرحلہ تک پہنچتے ہی نہیں تھے، وہ بالعموم ہنگاموں کی نذر ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن اگر کسی مناظرہ میں، مسلمان مناظر کی جیت بھی ہو جاتی تھی تو اس سے یہ سمجھ لینا کہ اس سے اسلام کا غلبہ ثابت ہو گیا، خود فریبی تھی۔ اوّل تو اس سے مذہب اسلام کی جیت ثابت ہو سکتی تھی نہ کہ دینِ اسلام کی فتح۔ جب اسلام مذہب تھا ہی نہیں، دین تھا تو اس

کے مذاہب سے مقابلہ کا کیا مطلب ؟ باقی رہا بارجیت کا معاملہ، تو قرآن نے کہا تھا کہ دینِ اسلام، باقی ادیان پر غالب آجائے گا۔ ظاہر ہے کہ کسی نظام کے دوسرے نظام پر غالب آجانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ غالب نظام کارفرما رہے گا اور مغلوب نظام کا دور دورہ ختم ہو جائے گا۔ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ۔ کا مطلب یہ تھا کہ انسانوں کے خود ساختہ تمام نظام آہستہ آہستہ ازکار رفتہ ثابت ہوتے جائیں گے اور دنیا اسی نظام کو قبول اور اختیار کرے گی جسے محمد رسول اللہ نے پیش کیا تھا۔ میرے لئے یہ تو مشکل ہی نہیں ناممکن ہے کہ میں ایک نشست میں اس کی تفصیل پیش کر سکوں کہ وہ نظامِ حیات (یعنی دین) جسے حضور نبی اکرم نے دنیا کو دیا ہی نہیں تھا بلکہ اسے متشکل کر کے بھی دکھا دیا تھا۔ اس کے کتنے گوشے اب تک انسانوں کے خود ساختہ نظاہائے حیات پر غالب آچکے ہیں، اور انسانی نظاموں کے جو گوشے ابھی تک اس منتہا تک نہیں پہنچے، وہ اس تک پہنچنے کے لئے کس قدر مضطرب و بیقرار ہیں۔ میں ان میں سے چند ایک گوشے ہی آپ کے سامنے لا سکوں گا۔

دین ایک ہی تھا

دین کے متعلق میں نے کہا ہے کہ وہ ان ابدی اصولوں اور غیر متبدل اقدار و ضوابط کا مجموعہ ہوتا ہے جسے انسانی زندگی کے لئے نظام بنانا مقصود ہے۔ دین کے یہ اصول شروع سے آخر تک ایک ہی رہے ہیں۔ یعنی یہ اصول مختلف زمانوں میں، مختلف اقوامِ عالم کو مختلف انبیاء کرام کی وساطت سے ملتے رہے تھے۔ سورۃ شوریٰ میں ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَ عِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (۴۲/۱۳)

(اے نوعِ انسان!) تمہارے لئے اسی دین (نظامِ حیات) کی وضاحت کی جا رہی ہے جس کی ابتدا نوح سے ہوئی تھی اور انتہا اس رسول پر ہو رہی ہے۔ ان کے درمیان آنے والے تمام انبیاء مثل ابراہیم۔ موسیٰ۔ اور عیسیٰ (وغیرہم) کو بھی یہی دین دیا گیا تھا۔ اور ان سے کہا گیا تھا کہ اسے عملاً متشکل کریں اور اس میں کسی قسم کا تفرقہ پیدا نہ کریں۔

اس مقام پر وہ الفاظ بے ساختہ میری زبان پر آ رہے ہیں جنہیں میں نے اس حقیقت کی وضاحت کے لئے اپنی مایۂ سعادت تصنیف، معراجِ انسانیت، میں زیبِ قرطاس کیا تھا۔ اس تکرار کے لئے میں آپ حضرات سے معذرت خواہ ہوں لیکن مجھے امید ہے کہ آپ میرے وفورِ جذبات کا احترام کرتے ہوئے مجھے اس کی اجازت دیں گے۔ میں نے اس میں کہا تھا کہ یہ پیغام، جو لسانِ محمدی سے دنیا کو ملا، کوئی انوکھا پیغام تھا اور نہ یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اسی کتابِ مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھا جو محمد کی وساطت سے دنیا کو ملا۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی میں

اتاری گئی۔ مشامِ جاں نواز سے جہاں کہیں بھی عطر بیزی و عنبر فشانی کی، وہ لالہ و یاسمین کی انہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبیٔ آخر الزمان کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی کیا ہے؟ انہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی و سماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں ادھر ادھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی کیا ہے؟ انہی درخشندہ و تابندہ ذواتِ نادرہ کا پیکرِ حسن و زیبائی جن کی حقیقی آب و تاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے سنور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے، یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے، یہاں یہ ایک ایسے عدیم النظیر مصرع میں آب و تاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے یہ مالا۔ وہ پتیاں تھیں یہ پھول۔ وہ ذرے تھے یہ چٹان۔ وہ قطرے تھے یہ سمندر۔ وہ ستارے تھے یہ کہکشاں۔ وہ افراد تھے یہ ملت۔ وہ نقطے تھے یہ خطِ مستقیم۔ وہ ابتدا تھی یہ انتہا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست

رحمۃً للعالمینی انتہا ست

میں اس نظمِ مرصع کا آغاز اس مطلع سے کرنا چاہتا ہوں جسے قرآن کریم نے آسمانی سلسلۂ رشد و ہدایت کی اولین کڑی یعنی داستانِ حضرت نوحؑ کے نام سے پیش کیا ہے۔

اوّلین کڑی۔ حضرت نوحؑ

تاریخی قیاسات کی رو سے یہ آج سے قریب سات ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو سب سے پہلے وہ پیغام دیا جو دین کی اصل و اساس ہے یعنی یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ۔ اے میری قوم! تم حکومیت صرف خدا کی اختیار کرو۔ اطاعت صرف اس کے قوانین کی کرو۔ یہ پہلا نعرہ ہی اتنا بڑا انقلابی تھا کہ اس سے سردارانِ قوم کے قصرِ اقتدار میں تزلزل واقع ہو گیا۔ چنانچہ وہ مخالفت کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے۔ یہ تھے تو قوم کے سردار اور اکابرین ہی، لیکن قرآن نے جس لفظ سے انہیں پکارا ہے وہ ایک عظیم حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یہ لوگ مَلَاءِ قوم تھے۔ یعنی وہ لوگ جن کے ہاں رزق کی فراوانی تھی۔ جن کے برتن بھرے رہتے تھے۔ اس ایک تعارفی لفظ نے ساری حقیقت کھول کر رکھ دی کہ دعوتِ خداوندی کا عمودی نکتہ کیا ہوتا تھا۔ اور اس کی مخالفت کن لوگوں کی طرف سے ہوتی تھی۔ قرآن کریم نے یہ بات حضرت نوحؑ کے سلسلہ میں ہی نہیں کہی۔ اس نے کہا ہے کہ ہر رسول کی دعوت یہی تھی اور اس کی مخالفت بھی اسی طبقہ کی طرف سے ہوتی تھی۔ ان لوگوں نے اس دعوت کی مخالفت کیا کہہ کر کی؟ یہ غور سے سننے کے قابل ہے۔ انہوں نے کہا کہ — مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا۔ (۱۱/۲۷)۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تم ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو۔ فوق البشر نہیں ہو۔ تم میں کوئی خارقِ فطرت بات نہیں۔ یعنی

انسان کی اعجوبہ پرستی کا تقاضا تھا کہ جو شخص خدا کی بات کہے اُسے فوق الفطرت قوتوں کا حامل ہونا چاہیئے۔ وحیِ خداوندی نے آج سے سات ہزار سال قبل جب کہ ساری دنیا پر جہالت کی تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں اور انسانی ذہن فوق الفطرت شعبدہ بازیوں اور چیستاں طرازیوں کے تصورات میں ڈوبا ہوا تھا، اس کی تردید کی اور کہا کہ جو بات کہی جا رہی ہے اُسے عقل و فکر کی میزان میں تولو، اور غور و تدبر کی کسوٹی پر پرکھو۔ یہی صحیح اور غلط کے جانچنے کا معیار اور حق و باطل کے ماپنے کا پیمانہ ہے۔ یہ چیز کسی بات کی صداقت کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ اس کا پیش کرنے والا کوئی محیر العقول کرشمہ دکھا دیتا ہے۔

آپ سوچئے، عزیزانِ من! کہ یہ بات کسی ایک قوم، ایک ملک، ایک زمانہ کی نہیں، ساری دنیا شروع سے اس تصور کی حامل رہی کہ سچی بات اسی کی ہو سکتی ہے جس سے کوئی کرامت سرزد ہو لیکن قرآن نے کہا کہ جھوٹ اور سچ غلط اور صحیح، حق اور باطل کا یہ کوئی معیار نہیں۔ اس کا معیار یہ ہے کہ مخالفین سے کہا جائے کہ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (۲/۱۱۱) اگر تم سچے ہو تو اپنے دعوے کی تائید میں دلیل پیش کرو۔ میں پوچھتا یہ ہوں کہ دینِ خداوندی کا عطا کردہ یہ تصور، دنیا کے باطل تصور پر غالب آرہا ہے یا نہیں؟ آج دنیا عقل و فکر، اور دلیل و برہان کو معیارِ صداقت قرار دیتی ہے یا افسون گری اور شعبدہ بازی کو؟ محمدؐ کے عطا فرمودہ دین کا اعلان تھا کہ اہلِ جہنم کی نشانی یہ ہے کہ لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ (۷/۱۷۹) یہ لوگ دل و دماغ رکھتے ہیں لیکن ان سے سوچنے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں، کان رکھتے ہیں لیکن سنتے نہیں۔ یہ انسان نہیں حیوان ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔ آج دنیا میں شور مچ رہا ہے کہ ہمارا زمانہ، عصرِ عقل و شعور (AGE OF RATIONALISM) ہے۔ اس میں توہم پرستی اور جہالت کا گزر نہیں ہو سکتا۔ لیکن انہیں کون بتلائے کہ عصرِ عقل و شعور بیسویں صدی میں شروع نہیں ہوا۔ اس کا آغاز چھٹی صدی عیسوی میں ہو گیا تھا جب داعیِ اسلام نے یہ اعلان فرمایا تھا کہ

اَدْعُوا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي (۱۲/۱۰۸)

میں جو خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں تو عقل و بصیرت کی بنا پر دعوت دیتا ہوں۔
میں بھی ایسا کرتا ہوں اور میرے متبعین بھی ایسا ہی کریں گے۔

—— (۸) ——

طبقاتی تقسیم

اب داستانِ حضرت نوحؑ کی اگلی کڑی کو لیجئے۔ ان اربابِ ثروت و دولت نے پہلے اعتراض

تو یہ کیا کہ تم ہمارے ہی جیسے انسان ہو تم سے کوئی فوق الفطرت کرامات سرزد نہیں ہوتیں۔ ہم تمہاری بات کس طرح مان لیں۔ اور دوسرا اعتراض یہ کیا کہ وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا۔ (۱۱/۲۷) ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے تمہاری دعوت پر لبیک کہا ہے وہ ہمارے معاشرہ کے نچلے درجہ کے لوگ ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے پیشوں سے متعلق ہیں۔ آج کی اصطلاح میں وہ کاسب (WORKERS) ہیں۔ اگر ہم تمہاری دعوت قبول کر لیں تو ہمیں ان کے ساتھ بیٹھنا پڑیگا۔ وہ ہمارے برابر ہو جائینگے۔ ہم اسے کسی صورت میں گوارا نہیں کر سکتے۔ یعنی انہوں نے اس دعوت کے خلاف عقل و فکر کی رُو سے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اعتراض یہ کیا کہ اس سے ادنیٰ اور اعلیٰ کا امتیاز ختم ہو جائے گا۔ اس سے یہ "کمتی" ہم بالاطبقہ کے معززین کے برابر ہو جائینگے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر یہ لوگ تمہارے ساتھ ہو گئے ہیں تو یہ اس امر کی دلیل نہیں کہ تمہاری دعوت صداقت پر مبنی ہے۔ یہ لوگ بَادِيَ الرَّأْيِ (۱۱/۲۷) واقعہ ہوتے ہیں۔ نہایت واجبی عقل و فکر اور سطحی رائے کے مالک۔ سنجیدہ عقل و فکر کے مالک، ارباب دولت ہوتے ہیں۔ انہی کی رائے، رائے کہلانے کی مستحق ہے۔ ان محنت کشوں کی عقل کیا اور رائے کیا؟ بات بالکل واضح ہے۔ مَا نَرَىٰ لَكُمْ عَلَيْنَا مِن فَضْلٍ۔ (۱۱/۲۷) تمہیں اور تمہاری جماعت کو ہمارے مقابلہ میں معاشی برتری حاصل نہیں۔ اور یہی چیز اس کا بین ثبوت ہے کہ تم لوگ اپنے دعوے میں جھوٹے ہو۔ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِينَ۔ (۱۱/۲۷) یعنی رائے بھی اسی کی قابلِ اعتنا قرار پا سکتی ہے جو دولت مند ہو۔ اور سچا بھی اسی کو سمجھا جا سکتا ہے جو سرمایہ دار ہو۔ چھوٹے طبقے کے پیشہ ور، کاسب، محنت کش، رذیل بھی ہوتے ہیں اور احمق بھی۔ ہم کسی ایسے مسلک کو قبول نہیں کر سکتے جس میں طبقاتی امتیاز کو مٹا کر، سرمایہ دار اور محنت کش کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا جائے۔ تم انہیں اپنے ہاں سے نکال دو۔ اپنی جماعت سے الگ کر دو پھر ہم تمہاری دعوت قبول کر لینگے۔

اس کے جواب میں اس داعیٔ انقلاب خداوندی نے کہا کہ عقل و حماقت اور عزت و ذلت، رذالت و شرافت، پستی اور بلندی کے ماپنے کے تمہارے پیمانے غلط ہیں۔ وَمَا عِلْمِي بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ (۲۶/۱۱۲) مجھے اس سے غرض نہیں کہ یہ لوگ کیا کام کرتے ہیں۔ أَعْلَمُ بِمَا فِي أَنفُسِهِمْ (۱۱/۳۱) خدا کی نگاہ جوہر ذاتی پر ہوتی ہے، مال و دولت پر نہیں۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ یہ شخص کردار کیسا ہے۔ یہ نہیں کہ اس کے پاس کیا ہے۔ اس کی نگاہ شرفِ انسانیت پر ہوتی ہے، زر و جواہر پر نہیں۔ تم کہتے ہو کہ میں فوق البشر نہیں۔ میں نے کب کہا ہے کہ إِنِّي مَلَكٌ (۱۱/۳۱) میں فرشتہ ہوں۔ تم کہتے ہو کہ تم پر معاشی فضیلت حاصل نہیں۔ میں نے کب کہا ہے کہ عِندِي خَزَائِنُ اللَّهِ۔ (۱۱/۳۱) میرے پاس خدا کے خزانے ہیں۔ میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ یہ تو تم نے مال و دولت کو معیارِ عزت و فضیلت اور مقیاسِ بلندی و برتری قرار دے کر انسانوں کو طبقات میں تقسیم کر رکھا ہے، یہ تصور باطل ہے اور جو نظام اس تصور پر قائم ہوگا وہ تباہ ہو جائے گا۔ وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ۔ (۲۶/۱۱۴) میں تمہاری خاطر ان لوگوں کو دھتکار نہیں سکتا جو نظامِ خداوندی کی صداقت کو تسلیم کر چکے ہیں۔ اگر میں تمہاری

خاطر اس ظلم کا مرتکب ہو جاؤں تو تم تو راضی ہو جاؤ گے لیکن ۔ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ ۔ (۶۹/۲۰) مشکل یہ ہے کہ یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی ۔ یہ آگے بھی چلتی ہے ۔ یہ کل کو خدا کے حضور جائینگے ۔ انہوں نے جب اُس سے کہا کہ اس سے پوچھئے کہ اس نے ہمیں کس جرم کی پاداش میں دھتکار دیا تھا، تو میں اس کا جواب کیا دوں گا ۔ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ ۔ (۱۱/۶۹) اس وقت مجھے خدا کی گرفت سے کون بچائے گا ؟ ویسے بھی اس قسم کی سودے بازی تو وہ کرے جس کے سامنے کوئی ذاتی مفاد ہو ۔ میری یہ کیفیت ہے کہ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۔ (۱۱/۲۹) میں تم سے کسی مالی معاوضہ کا خواہاں نہیں ۔ میرے سامنے کوئی ذاتی مفاد نہیں ۔ اس لئے تمہاری دولت و ثروت کی کشش اس انقلاب آفرینی میں میرے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی ۔ تم اگر اس دعوت کو قبول کر لو گے تو اس سے تمہارا ہی بھلا ہوگا ۔ مجھے کچھ حاصل نہیں ہوگا ۔ نہ مانو گے تو تم تباہ ہو جاؤ گے ۔ میرا کچھ نہیں بگڑے گا ۔ تم سمجھتے ہو کہ تمہارا لیڈر جس کی خصوصیت فقط یہ ہے کہ اس کے پاس مال و دولت زیادہ ہے اور اس کا جتھہ بڑا ہے، تمہیں تباہی سے بچا لیگا ۔ یہ تمہاری خود فریبی ہے ۔ جس معاشرہ کا نظام اس قسم کی طبقاتی تقسیم پر مبنی ہو، اس کا لیڈر اور اس کا مال اور جتھہ اسے تباہی سے بچا نہیں سکتا ۔ (وَ) لَمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَ وَلَدُهٗ اِلَّا خَسَارًا (۷۱/۲۱) یہ چیزیں تو بلکہ اس تباہی کو اور بھی زیادہ شدید کر دیتی ہیں ۔

یہ آوازِ دینِ خداوندی کے سب سے پہلے علمبردار نے بلند کی اور اسی کو اس کے آخری پیغمبر نے اٹھایا ۔ اس آواز کی مخالفت بھی اسی طبقہ کی طرف سے ہوئی جسے اپنی دولت و ثروت کی کثرت پر ناز تھا ۔ انہی کو خدا نے مترفین کہہ کر پکارا ہے ۔ یعنی دوسروں کی کمائی پر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے والے ۔ انہوں نے بھی قومِ نوح کی طرح یہی مطالبہ کیا تھا کہ یہ چھوٹے طبقے کے لوگ جو آپ کے گرد جمع ہو گئے ہیں، انہیں نکال دیجئے تو ہم آپ کی دعوت قبول کر لیتے ہیں ۔ اس پر ارشادِ خداوندی ہوا کہ اے دعوتِ انقلابِ خداوندی ! لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۔ (۲۰/۱۳۱ ؛ ۱۵/۸۸) ان لوگوں کو دنیاوی زندگی کی آسائشوں اور زیبائشوں میں سے جو طرح طرح کا سامان حاصل ہے، تم اس کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا اور انہیں اپنے ساتھ ملانے کی خاطر لَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ۔ (۶/۵۲) کہیں ایسا نہ کرنا کہ ان لوگوں کو دھتکار دو ۔ جنہوں نے دعوتِ خداوندی کو بروئے کار لانے کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کر رکھا ہے اور اس میں کسی قسم کا ذاتی مفاد ان کے پیشِ نظر نہیں ۔

آپ غور کیجئے عزیزانِ من ! کہ طبقاتی تقسیم کے خلاف یہ آواز کس زمانے میں اٹھائی گئی ۔ مفاد پرست گروہوں کی سازشوں نے اس آواز پر مبنی نظام کو عالمگیر نہ ہونے دیا اور طبقاتی تقسیم کی گرہیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئیں ۔ اس سطح میں نگاہیں اس فریب میں آگئیں کہ دینِ خداوندی کو شکست ہو گئی ہے ۔ لیکن آپ دیکھئے کہ زمانے کے تقاضے انسان کو مار مار کر کس طرف

لا رہے ہیں؟ طبقاتی تقسیم کو قائم رکھنے کی طرف یا اُسے مٹانے کی طرف؟ آج یہ آواز دنیا کے ہر حصے سے اُٹھ رہی ہے کہ

تمیزِ بندہ و آقا، فسادِ آدمیت ہے

طبقاتی تفریق و تقسیم، وجہِ فسادِ عالم ہے۔ اسے مٹا دینا چاہیئے۔

عوام و خواص کی تفریق

لیکن یہ آواز ذہنوں کے تقاضوں سے اُبھری ہے۔ اس نے ابھی شمعِ مصطفوی سے اکتسابِ ضیا نہیں کیا۔ یہ "ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ است"۔ نداءِ مصطفوی نے طبقاتی تفریق و تقسیم کے مٹانے کا اصول کچھ اور بتایا تھا۔ بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ انسان نے اپنی عقلی طریقِ کار کی رُو سے، اتنا تو سمجھ لیا ہے کہ طبقاتی تقسیم تباہی کا موجب ہے۔ لیکن ابھی وہ اس حقیقت تک نہیں پہنچ سکا کہ اس کے مٹانے کا طریق اور اصول کیا ہے۔ طبقاتی تفریق کو مٹانے کی آواز سب سے زیادہ گھن گرج کے ساتھ سوشلسٹ ملکوں سے اٹھی۔ لیکن وہاں جاکر دیکھیے کہ کیا یہ تفریق واقعی مٹ چکی یا مٹ رہی ہے؟ وہاں یہ تفریق اُسی طرح باقی ہے۔ وہاں ابھی تک ورکر ورکر ہی ہے۔ ہمارے ہاں مساوات کے سلسلہ میں عوام کا لفظ دن میں سو سو بار دہرایا جاتا ہے۔ کیا اس سے یہ تفریق مٹ گئی ہے۔ مٹ جانا تو ایک طرف، اس سے تو اس تفریق پر اور بھی شدت سے مہرِ تصدیق ثبت ہو رہی ہے۔ یہ حقیقت بدیہی ہے کہ ہر لفظ کا مفہوم اس کی ضد سے متعین ہوتا ہے۔ روشنی کا کوئی مفہوم سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک تاریکی کا تصور سامنے نہ آئے۔ یعنی جب ہم روشنی کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے تاریکی کا وجود ثابت ہو جاتا ہے۔ جب ہم "غربا کا طبقہ" کہتے ہیں تو اس کا لازمی مفہوم یہ ہوتا ہے کہ یہاں ایسا طبقہ بھی ہے جو غربا کا نہیں، اُمرا کا ہے۔ اسی طرح جب ہم عوام کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہاں خواص بھی ہیں۔ لہٰذا، عوام کے لفظ میں، خواص اور عوام کی تفریق کا تصور موجود ہے۔ میں نے یہ دو ایک مثالیں محض سمجھانے کی خاطر دی ہیں، ورنہ یہ حقیقت ہے کہ ابھی صرف طبقاتی تقسیم کے مہلک کا احساس بیدار ہوا ہے۔ اس جہنم سے نکلنے کا راستہ سامنے نہیں آیا۔ یہ راستہ اسے دینِ خداوندی سے ملے گا جس نے اعلان کیا کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ۔ (۱۷/۷۰) یاد رکھو! تمام انسان، محض انسان ہونے کی جہت سے، یکساں واجب التکریم ہیں۔ اس کے بعد کہا کہ وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا۔ (۴۶/۱۹)۔ معاشرہ میں مدارج کا تعین افرادِ معاشرہ کے حسنِ عمل کی رُو سے ہوگا، نہ کہ حسبِ نسب یا مال و دولت کی نسبت سے۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ معاشرہ میں مختلف کام مختلف لوگوں کے سپرد رہیں گے (۴۳/۳۲)۔ لیکن باہمی تعاون کی شکل میں ہوگا۔ اس سے تکریم و تعظیم یا اونچ نیچ کا تعین نہیں ہوگا۔ تکریم کا معیار ایک ہی ہوگا۔ اور وہ یہ کہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ۔ (۴۹/۱۳)۔ تم میں سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہوگا جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کا پابند ہوگا۔ اس طرح وہ طبقات جن کا مدار پیدائشی تفریق پر ہے (جیسے ہندوؤں کے ورن) یا نسلی امتیاز، یا ذات برادری کا فرق جو نسلی امتیاز ہی کی دوسری شکل ہے) یا معاشی اختلاف پر۔ سب ختم ہو جائینگے اور عزت و تکریم

کا معیار حسنِ سیرت (اخلاقی پاکیزگی) ہوگا۔ حضور نبی اکرمؐ نے دین کے اسی اصول کے مطابق ایک امت متشکل فرمائی جس میں طبقاتی تفریق کا تصور تک نہ تھا۔ اس میں بندہ اور آقا۔ آجر و مستاجر۔ مزدور اور مالک۔ محنت کش اور سرمایہ دار۔ حتیٰ کہ حاکم اور محکوم تک کی بھی کوئی تمیز و تخصیص نہ تھی۔ اس میں باہمی تفاوت کی رُو سے معاشرہ کے تمام کام بطریقِ احسن سرانجام پاتے تھے۔ لیکن کام یا پیشہ کی نسبتوں سے اعلیٰ و ادنیٰ کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ اس میں امت کے تمام افراد مومن یا مسلم کہہ کر پکارے جاتے تھے اور خود ذاتِ رسالتمآبؐ کا بھی اعلان تھا کہ انا اول المسلمین۔ میں سب سے پہلا مسلم ہوں۔ اس میں عوام یا خواص کے الفاظ تک نہ تھے۔ "عوام" کے تو لفظ تک میں ذلت کی جھلک موجود ہے۔ اس امت کے افراد کے متعلق جو کہا گیا ہے کہ۔ تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔ تو یہ منظر صحنِ مسجد تک محدود نہیں تھا۔ زندگی کے ہر گوشے میں کارفرما تھا۔

بہرحال، جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے 'انسان' اپنے تجربات و مشاہدات کی بناء پر طبقاتی تقسیم کی تباہ کاریوں کو تو محسوس کرنے لگ گیا ہے۔ لیکن ابھی اسے اس جہنم سے نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا۔ یہ اس وقت ہوگا جب اس کے سامنے مساواتِ محمدیؐ کا دروازہ کھل گیا۔ اُس وقت دینِ محمدیؐ کا یہ گوشہ بھی باقی ادیان پر غالب آجائے گا۔

(0)

دعا کیسے قبول ہوتی ہے

اس داستان میں جب ہم ایک قدم آگے بڑھتے ہیں تو وہاں ایک مقام ایسا سامنے آتا ہے جو بیک وقت بیحد فکر انگیز بھی ہے اور نہایت نازک بھی۔ حضرت نوحؑ دعا مانگتے ہیں کہ بار الہا! ہمیں اس آنے والی تباہی سے محفوظ رکھ۔ بارگاہِ خداوندی سے جواب ملتا ہے کہ نوحؑ! ہم نے تیری دعا سن لی ہے اور اسے قبول بھی کر لیا ہے۔ قرآن کے الفاظ ہیں۔ وَ نُوحًا اِذْ نَادٰی مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ..... (۲۱/۷۶)
اب ظاہر ہے کہ جب دعا مانگنے والا ہو ایک رسولؑ اور خود خدا کی طرف سے جواب آئے کہ ہم نے تیری دعا قبول کر لی ہے، تو اس کے بعد کچھ بھی کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن یہ کہنے کے بعد کہ ہم نے تیری دعا قبول کر لی ہے، اُسی سانس میں کہا کہ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا۔ (۱۱/۳۷)، تم ہماری زیرِ نگرانی اور ہماری وحی کے مطابق، ایک کشتی بناؤ۔ اس کے ذریعے تم سیلاب سے محفوظ رہ سکو گے۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہ کتنی بڑی اہم حقیقت ہے جسے دینِ خداوندی نے دو لفظوں میں واشگاف کر دیا ہے۔ مذہب کی دنیا میں انسان مصیبتوں سے بچنے کے لئے، مسند نشینانِ مملکتِ روحانیت کی درگاہوں میں اور مقربینِ بارگاہِ خداوندی کے مزاروں پر دعائیں کرنے اور کرانے کے لئے مارا مارا پھرتا ہے۔ اور یا اپنے مصلے پر بیٹھا دعاؤں کی تسبیح پڑھتا رہتا ہے۔ اور اتنا نہیں سوچتا کہ جب خدا نے اپنے ایک رسول تک سے کہہ دیا کہ تیری دعا تو قبول ہے لیکن سیلاب بلا سے تیری نجات کشتی بنانے ہی سے

ہو سکے گی، تو ہم خالی دعا کر لینے یا کرا لینے سے مصیبتوں سے کیسے بچ سکتے ہیں! چونکہ ہمارے ہاں بھی دین نہیں مذہب ہی کا دور دورہ رہا ہے اس لئے ہم بھی انہی وادیوں میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ لیکن اب حوادث زمانہ ہمیں حقیقت کی طرف آنے کے لئے مجبور کر رہے ہیں۔ ہمیں پچیس سال ہونے کو آئے، اُس قوم کی مٹھی بھر جماعت نے جسے ہم مغضوب علیہ کہہ کر پکارا کرتے تھے (یعنی یہودیوں نے) ساٹھ ستر کروڑ مسلمانوں کے قلب میں خنجر پیوست کر کے، وسط عرب میں اپنی مملکت قائم کر لی۔ ہمیں پچیس سال ہی سے ساری دنیا کے مسلمان، عام مساجد ہی میں نہیں، خود خانہ کعبہ میں، نہایت الحاح وزاری سے دعائیں مانگتے چلے آ رہے ہیں کہ وہ مملکت تباہ ہو جائے۔ لیکن وہ مملکت اور مستحکم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس سے سوچنے والے ذہنوں کے سامنے دین کی یہ حقیقت واشگاف ہو رہی ہے کہ طوفانوں سے بچنے کے لئے دعاؤں کے ساتھ کشتیاں بنانا بھی ضروری ہیں۔ یہی دینِ محمدی کا پیغام تھا جس کی طرف اب ہم مجبوراً آ رہے ہیں۔

قوانینِ فطرت کا علم

یہیں سے دین کا ایک اور گوشہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ مذہب کی دنیا میں مادی اسباب و ذرائع کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا اور اسے روحانیت کی ضد قرار دیا جاتا ہے۔ یہ نفرت ہمارے قلوب کی گہرائیوں میں اس حد تک سرایت کر چکی ہے کہ ہمارے عقیدہ کی رُو سے مادیت اور دہریت مترادف المعنیٰ الفاظ سمجھے جاتے ہیں۔ دین اس تصور کے خلاف چیلنج ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قوانینِ فطرت جن کے مطابق یہ مادی کارگہ کائنات اس حسن و خوبی سے سرگرم عمل ہے، خدا ہی کے مقرر کردہ قوانین ہیں، اور ان کا علم و اتباع بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح وحیِ خداوندی کا علم و اتباع۔ ان قوانین کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت انسان کے اندر رکھ دی گئی ہے۔ جب خدا نے کہا تھا کہ وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّھَا۔ (۲۱/۳) ہم نے آدم کو تمام اشیائے کائنات کا علم عطا کر دیا ہے، تو اس سے یہی مراد تھی۔ انسانی زندگی کے ابتدائی دور میں، انسان نے ہنوز اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ وہ ان قوانین کا علم جلدی جلدی حاصل کر لیتا، اس لئے خدا نے حضرت نوحؑ کو یہ بھی وحی کے ذریعے بتایا کہ کشتی کیسے بنائی جاتی ہے۔ اس کے بعد جو قوم بھی کشتیاں بناتی ہے ــ خواہ ان کی کیفیت اور نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو، وہ اصل کے اعتبار سے اُسی وحی خداوندی کا اتباع کرتی ہے۔ یہ صرف سمجھانے کے لئے ایک مثال تھی، ورنہ عالمِ اسباب میں انسان جس قدر مادی ذرائع و سامان تیار کرتا ہے وہ قوانینِ خداوندی کے اتباع ہی سے کرتا ہے۔ لہٰذا ان قوانین سے تغافل برتنا ایک معنی میں کفر ہے، اور ان کی خلاف ورزی معصیت۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جو انسان یا قوم ان قوانین کا اتباع کرتی ہے، وہ مقصدِ حیات

پورا کرتی اور مومن بن جاتی ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہوتا۔ قوانینِ فطرت، ضابطۂ خداوندی یعنی اس کی کتاب مبین، کا صرف ایک باب ہے۔ اس کا دوسرا باب وہ ہے جو انسانی زندگی کے لئے راہ نمائی عطا کرتا ہے اور جو اب قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ دین، ان دونوں ابواب کے اتباع سے مکمل ہوتا ہے۔ یعنی قانونِ فطرت کے مطابق کشتی بنانا اور اسے اس مقصد کے لئے استعمال کرنا جسے اقدارِ خداوندی نے متعین کیا ہے۔ دیکھئے، داستانِ حضرت نوحؑ میں اس درخشندہ حقیقت کو کس حسن و ایجاز سے بیان کیا گیا ہے۔ پہلے کہا گیا کہ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا۔ ہماری وحی کے مطابق کشتی بناؤ۔ اور جب کشتی بن گئی تو کہا (وَقَالَ) ارْكَبُوْا فِيْهَا۔ بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا۔ (۱۱/۴۱) اب اس میں سوار ہو جاؤ، اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے کہ اس کا چلنا بھی اس مقصد کے لئے ہے جسے خدا نے مقرر کیا ہے اور اس کا رکنا بھی۔ یہ ہے مکمل دین۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۶/۱۶۳)
کہہ دو کہ میری صلوٰۃ اور زندگی کے دیگر طور طریق۔ میرا جینا اور مرنا۔ سب اس خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے جو ربوبیت عالمین کا ذمہ دار ہے۔

جیسا کہ میں اکثر کہا کرتا ہوں، اسلام کے معنی ہیں فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں اقتدارِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا۔ کتابِ زندگی کے یہ دونوں باب — یعنی قوانینِ فطرت اور اقتدارِ خداوندی — ایسے نہیں کہ اگر ان میں سے ایک حصہ پر عمل کر لیا جائے اور دوسرا حصہ چھوڑ دیا جائے، تو کم از کم آدھا مقصد حاصل ہو جائے گا۔ قطعاً نہیں۔ یہ دونوں باب لازم و ملزوم ہیں۔ ان کے امتزاج کی مثال یوں سمجھئے جیسے پانی کا قطرہ مرکب ہوتا ہے دو حصہ ہائیڈروجن اور ایک حصہ آکسیجن سے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا کہ ان دونوں اجزا کو الگ کر دیا جائے تو ⅔ پانی ایک طرف ہو جائے اور ⅓ دوسری طرف۔ اس صورت میں پانی کا وجود ہی ختم ہو جائے گا اور اس مرکب کے جو دو اجزاء الگ ہوں گے ان کی خاصیت پانی سے مختلف ہی نہیں متضاد ہو گی۔ اسی طرح اگر قوانینِ فطرت اور اقتدارِ خداوندی کو الگ کر لیا جائے تو دین باقی ہی نہیں رہ سکتا۔ مذہب میں، قوانینِ فطرت کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور (بزعمِ خویش) احکامِ خداوندی کی اطاعت کی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ اسے قرآن کے الفاظ میں سنئے۔ فرمایا کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ کیا تم لوگ ضابطۂ قوانینِ خداوندی کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہو، اور اس کے دوسرے حصہ سے انکار کرتے۔ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ۔ (۲/۸۵) تم میں سے جو بھی ایسا کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو گا کہ اسے دنیاوی زندگی میں ذلت و خواری نصیب ہو گی اور قیامت کے دن شدید ترین عذاب میں مبتلا ہو گا۔ ہم نے کتابِ خداوندی کے ایک باب یعنی قوانینِ فطرت سے تغافل برتا تو ذلت و مسکنت کا جو عذاب ہم پر مسلط ہوا وہ ہماری حالت سے ظاہر ہے۔ اور اقوامِ مغرب نے فطرت کی قوتوں کو تو مسخر کر لیا لیکن اقتدارِ خداوندی سے اجتناب کیا تو

آخرت میں جو کچھ ان پر بیتے گی اُسے تو اُس وقت دیکھا جائے گا، وہ اس وقت بھی جس جہنم کے عذاب میں گرفتار ہیں اس کے شعلوں نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ دنیا نے کتابِ خداوندی کو ورق ورق کرنے کا انجام دیکھ لیا ہے۔ لیکن چونکہ دین ان کے سامنے نہیں اس لئے انہیں ان اوراقِ پریشاں کی شیرازہ بندی کا طریقہ نہیں سوجھتا۔ لہٰذا، (ہمارے الفاظ میں یوں کہئے کہ) یہ لوگ عالمِ برزخ میں ہیں۔ مذاہب رفتہ رفتہ ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ اور مذہب پرست اقوام سیکولرازم کا نظام اختیار کئے جا رہی ہیں۔ یعنی یہ لاالٰہ کے مقام تک آ گئی ہیں، الا اللہ کی مادی فردوس بداماں میں ہنوز نہیں پہنچیں۔ یہ "ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ" ہیں۔ دوسری طرف اقوامِ مغرب اپنی سیکولرازم سے تنگ آ کر کسی ایسے نظام کی تلاش میں ہیں جو انہیں اس عذابِ الیم سے نجات دلائے۔ ایسا نظام جو امریکہ کے ممتاز ماہرِ نفسیات (ERIC FROMM) کے الفاظ میں:-

> انسان کی ارتقائی منازل کا ساتھ دے گا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ عالمگیر ہوگا اور منتشر انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک کر دے گا جو مشرق و مغرب کی تمام تعلیمات کا مہیمن ہوگا۔ وہ عقل و بصیرت پر مبنی ایسا قابلِ عمل ضابطۂ حیات دے گا جو علوم سائنس سے ہم آہنگ ہو۔ وہ انسان کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ خارجی کائنات اور خود اپنی ذات کے ساتھ ہم آہنگ رہ سکے۔ اسی نظام کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ نوعِ انسان کا مذہب بن سکے۔
>
> (THE SANE SOCIETY)

اور ظاہر ہے کہ یہ نظام اس الدّین کے سوا اور کونسا ہو سکتا ہے جسے حضورؐ خاتم النبیینؐ نے دنیا کو دیا تھا۔

—(0)—

معیارِ قومیت

اب اس داستان کا ایک اور ورق الٹیے اور اس باب کو سامنے لائیے جو نظامِ خداوندی کا گویا کونے کا پتھر ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۔ فَاخْتَلَفُوْا ... (۱۰/۱۹، ۲/۲۱۳) نوعِ انسان شروع میں ایک برادری تھی۔ پھر انہوں نے آپس میں اختلافات پیدا کر لئے اور اس طرح وہ عالمگیر برادری مختلف ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ یہ اختلافات کیا تھے؟ خون کا اختلاف۔ رنگ کا اختلاف۔ نسل کا اختلاف۔ زبان کا اختلاف۔ وطن کا اختلاف۔ ان اختلافات کی بنا پر وہ انسانی برادری مختلف قبیلوں اور قوموں میں تقسیم ہو گئی اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کا بیری اور ایک قوم دوسری قوم کے خون کی پیاسی ہو گئی۔ جب صورت یہ ہو گئی۔ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۔ (۲/۲۱۳) تو اللہ نے انبیاء کو مبعوث کیا تاکہ وہ انہیں اس تفرقہ کی تباہ کاریوں سے آگاہ کریں اور نوعِ انسان کو عالمگیر برادری کی جنت بداماں زندگی

کی خوشگواریوں کی بشارت دی۔ خدا نے ان انبیاء کے ساتھ ضوابط قوانین بھی نازل کئے۔ تاکہ وہ ان ضوابط کی رُو سے اقوامِ عالم کے اختلافی امور کا فیصلہ کریں اور انہیں ایک امت کے قالب میں ڈھال دیں۔ یہ ہے قرآن کی رُو سے سلسلۂ رشد و ہدایتِ خداوندی کا اولین مقصد یعنی قومیتوں کی تشکیل کے لئے انسانوں کے خودساختہ معیاروں کو ختم کر کے اقتدارِ خداوندی کی رُو سے نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری میں منسلک کر دینا۔ اسی کو موجودہ دور کی اصطلاح میں دو قومی نظریہ کہتے ہیں۔ یعنی جو لوگ اجتماعیت کے اس اصول پر ایمان رکھیں، وہ ایک قوم (امت) کے افراد اور باقی سب دوسری قوم کے افراد۔

ہم نے ابھی ابھی دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعثتِ انبیاء کرام کا مقصدِ اولین یہی بتایا ہے۔ لہٰذا اس اصول پر عمل بھی سلسلۂ انبیاء کی اولین کڑی حضرت نوحؑ ہی سے شروع ہو گیا۔ ہوا یوں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ سے وعدہ کیا کہ اس آنے والی تباہی سے تیرے "اہل" بچا لئے جائیں گے۔ جب وہ طوفان آیا تو حضرت نوحؑ اور ان کی جماعت کے افراد کشتی میں سوار ہو گئے۔ لیکن خود حضرت نوحؑ کا بیٹا اس میں سوار نہ ہوا، اور باقی افراد کے ساتھ سیلاب میں ڈوب گیا۔ حضرت نوحؑ پر یہ بات از خود واضح نہ ہو سکی کہ جب خدا نے وعدہ کیا تھا کہ تیرے اہل "محفوظ رکھے جائیں گے" تو میرا بیٹا جو میرے اہل میں سرِفہرست تھا محفوظ کیوں نہ رکھا گیا۔ چنانچہ وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِىْ مِنْ اَهْلِىْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ۔ (۱۱/۴۵) نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ اے میرے نشوونما دینے والے! تو نے وعدہ کیا تھا کہ تو میرے اہل کو بچا لے گا۔ میرا بیٹا میرے اہل میں سے تھا۔ پھر اسے کیوں نہ بچا لیا گیا! مجھے تیرے فیصلے کے خلاف مجالِ احتجاج نہیں۔ اس کے سامنے تو میرا سرِتسلیم خم ہے۔ میں صرف یہ سمجھنا چاہتا ہوں کہ تیرے وعدے ہمیشہ سچے ہوتے ہیں، تو یہ واقعہ تیرے وعدے کے خلاف کس طرح سرزد ہو گیا۔ سوال آپ نے دیکھ لیا۔ اب اس کا جواب سنئے۔ فرمایا کہ نوحؑ! ہمارے وعدے بالکل برحق ہوتے ہیں۔ اور یہ واقعہ بھی ہمارے وعدے کے خلاف سرزد نہیں ہوا، عین اس کے مطابق ظہور میں آیا ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ اَہل کا صحیح مفہوم تمہاری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ تم نے عام تصور کے مطابق یہ سمجھا کہ جو لوگ خون کے رشتے میں منسلک ہوں، وہ اہل میں سے ہوتے ہیں۔ لیکن اقتدارِ خداوندی کی رُو سے اَہل اور غیر، اپنے اور بیگانے، کا یہ معیار نہیں۔ معیارِ خداوندی یہ ہے کہ جو لوگ ایمان میں مشترک ہوں، وہ اپنے، خواہ ان میں کوئی اور قدر مشترک نہ ہو۔ اور جو ایمان میں مشترک نہ ہوں، وہ سب بیگانے۔ خواہ وہ بیٹے ہی کیوں نہ ہوں۔

یہ تھا وہ معیار جس کی بنا پر تمام نوعِ انسان دو حصوں میں بٹ گئی۔ قرآن کے الفاظ میں۔ هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ..... (۶۴/۲) خدا نے تمہیں انسان پیدا کیا اور تم اپنے طرزِ عمل سے دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ وہ جو اقتدارِ خداوندی کو اپنا ضابطۂ حیات بناتا ہے اور دوسرا وہ جو اپنے بنائے ہوئے نظریات کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ اس معیار کے مطابق، حضرت نوحؑ ایک قوم کے فرد قرار پا گئے اور ان کا بیٹا دوسری قوم کا فرد۔

حضرت ابراہیمؑ ایک امت کے رکن قرار پائے اور ان کا والد دوسری قوم کا فرد۔ حضرت ابراہیمؑ نے دو ٹوک اعلان کر دیا کہ فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي (۱۴/۳۶) میرا اور میرے اپنوں میں سے وہ ہے جو میرے مسلک کا اتباع کرتا ہے۔ جنہوں نے اس مسلک کا اتباع نہ کیا آپؑ نے ان سے برملا کہہ دیا کہ كَفَرْنَا بِكُمْ۔ میرا تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ بَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا۔ تم میں اور مجھ میں ہمیشہ کے لئے بغض و عداوت رہے گی۔ اور اس بات کو میں خفیہ نہیں رکھنا چاہتا۔ تم سے برملا کہہ دینا چاہتا ہوں۔ یہ صورت اس وقت تک رہے گی۔ حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ (۶۰/۴) جب تک تم خدائے واحد پر ایمان نہیں لاتے۔ یہی وہ معیار قومیت تھا جس کے مطابق حضور نبی اکرمؐ نے ایک ایسی امت کی تشکیل فرمائی جس میں روم کا صہیبؓ، حبش کا بلالؓ اور فارس کا سلمانؓ باہم اختلاف رنگ و خون و نسل، زبان و وطن، ایک برادری کے افراد تھے اور خود حضورؐ کے حقیقی چچا، داماد اور دیگر اعزہ و اقارب، جو ایمان میں مشترک نہیں تھے، دوسری قوم کے افراد۔

دنیا نے اس اصول کو نہ مانا اور رنگ و نسل کی بنیادوں پر قبیلوں اور قوموں کی تشکیل کرتی رہی اور اس کے تباہ کن نتائج کا تجربہ کرنے کے بعد مختلف انداز سے پہلو بدلتی رہی تاآنکہ اب، آخرالامر، اس نے اشتراکِ وطن کو قومیت کا معیار قرار دے دیا۔ لیکن اس سے مختلف ممالک اور اقوام میں جس جہنم کے شعلے بلند ہوئے، انہوں نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اب وہ بیچ رہے ہیں اور اس سے نکلنے کا راستہ معلوم کرنے کے لئے بری طرح ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ یعنی "وہ ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ" ہیں۔ کیتھولک چرچ کا راندہ درگاہ اسقف (TEILARD - DE - CHARDIN) چلا چلا کر کہہ رہا ہے کہ:

> اب اقوام کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اگر ہم نے ہلاکت سے بچنا ہے تو کرنے کا کام صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے قدیم تعصبات کو ختم کر دیں اور مختلف ملکوں اور خطوں کی حدود سے آگے بڑھ کر، کرۂ ارض کی تعمیرِ نو کا انتظام کریں۔ انسان کو اس کی موجودہ پستیوں سے نکال کر بلندیوں کی طرف لے جانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے وحدتِ انسانیت کا راستہ۔ اب شعورِ انسانی کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاندان، وطن، اور نسل کی تنگ ناؤں سے آگے بڑھ کر پوری نوعِ انسان کو اپنی آغوش میں لے لے۔
>
> (BUILDING OF THE EARTH)

اور کیلیفورنیا یونیورسٹی کا پروفیسر (H. MILLER) تو یوں کہئے گویا قرآن کریم کی آیت کا ترجمہ پیش کر رہا ہے جس سے ہم نے اس بحث کا آغاز کیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ:

> تہذیب کا فریضہ ہے کہ وہ پھر سے اس انسانی برادری کا احیاء کرے جو انسانی زندگی کی ابتداء میں موجود تھی لیکن جو بعد میں عارضی طور پر خاندانوں، قبیلوں اور نسلوں میں بٹ گئی۔ تہذیب کہا ہی اسے جا سکتا ہے جو انسانوں کو باہم دگر جوڑ دے۔

انسانی ارتقاء کا اگلا قدم ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل ہونا چاہیئے جو تمام نوعِ انسان پر مشتمل ہو۔ (THE COMMUNITY OF MAN.)

اس مقام پر قرآن کریم میں بیان کردہ ایک اور حقیقت سامنے آگئی۔ اس نے کہا تھا کہ اللہ تک پہنچنے کے لئے پہلے، لا الٰہ ضروری ہے فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى.... (۲/۲۵۶)۔ خدا تک وہی پہنچ سکتا ہے جو پہلے ہر غیر خداوندی معبود سے انکار کر دے۔ صحیح راستہ اختیار کرنے کے لئے غلط راستے کا چھوڑنا لابُدّ شرط ہے۔ مذہب، باطل کے معبودوں کی پرستش گاہ ہوتا ہے۔ جب تک اسے چھوڑا نہ جائے انسان دین تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہود و نصاریٰ جیسے مذہب پرستوں کو بھی جو اسلام کی دعوت دی گئی تھی تو اس کی یہی وجہ تھی۔ اِس وقت ہو یہ رہا ہے کہ مذہب سے تنگ آنے والے مذہب کو تو چھوڑ دیتے ہیں، لیکن چونکہ دین ان کے سامنے ہوتا نہیں، اس لئے وہ سیکولرازم اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ بہرحال مذہب پرستی کے مقابلہ میں، دین کی طرف آنے کے لئے ایک قدم آگے ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ غلط نظامہائے حیات کے خلاف جس قدر آوازیں بلند ہو رہی ہیں، وہ اُنہی کی آوازیں ہیں جو مذہب کو چھوڑ چکے ہیں۔ اہلِ مذاہب کی طرف سے اس قسم کی کوئی آواز نہیں اُٹھتی۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ وطنیت کے خلاف، یورپ کے ملحد و بے دین تو آوازیں بلند کر رہے ہیں، لیکن مذہب پر مسلمان، رنگ، نسل، زبان اور وطنیت کی بنا پر مختلف قوموں میں بٹے ہوئے ہیں، اور دن بدن ان حلقوں کو اور زیادہ شدت سے کسے جا رہے ہیں۔ خود پاکستان کو دیکھئے جسے دین کے نام پر حاصل کیا گیا تھا لیکن جو مذہب کی تاریک ترین آماجگاہ بن گیا۔ اس مملکت کی بنیاد قرآنی نظریۂ قومیت پر رکھی گئی تھی لیکن یہاں حالت یہ ہے کہ نسلوں یا زبانوں کے اختلاف کی بنا پر چار چار قومیتوں کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ اور جو بزرگوار خیر سے دو قومی نظریہ کے حامل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، ان کی بھی حالت یہ ہے کہ زبان سے دو قومیں کہتے ہیں لیکن عملاً حدودِ پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں سب کو ایک قوم قرار دیتے ہیں۔ یعنی یہ بھی وطنیت کو معیارِ قومیت تسلیم کرتے ہیں۔ مذہبی پیشوائیت نہ اُن کے خلاف لب کشائی کرتی ہے، نہ ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہے۔ اور یہ کیفیت پاکستان تک ہی محدود نہیں، تمام مسلم ممالک میں یہی عالم ہے۔ مذہب کے پرستار کہیں بھی نسل یا وطن کی بنا پر قومیت کی تشکیل کے خلاف لب کشائی کرتے نظر نہیں آتے۔ ابھی ہم نے چند ہفتے پہلے (فروری کے آخر میں) اسی لاہور میں ساری دنیا کے مسلم ممالک کے سربراہوں کا اجتماع دیکھا ہے۔ وہ اجتماع مختلف ممالک کے مسلمان نمائندوں کا تھا، امتِ واحدہ کے نمائندوں کا نہیں تھا۔ حتیٰ کہ اس اجتماع میں یہاں تک کہہ دیا گیا کہ

انصاف اور سچائی کے اصولوں پر یقین ہمارے اتحاد کا باعث ہے۔ یہ اتحاد قومی نظریات سے نہیں ٹکراتا۔ (نوائے وقت ۲۳/۲/۷۴)۔

یعنی یورپ کے ملحد اور بے دین تو نورِ مصطفوی کی تلاش میں ہمہ تن مصروف ہیں، اور ہمارے ہاں کے شپرہ چشم اپنے اپنے ظلمت کدوں میں مست ہیں، اور دعائیں مانگتے ہیں کہ اس شمعِ عالمتاب پر پڑے ہوئے پردے اُٹھنے نہ پائیں۔ لیکن یہ پردے اٹھ کر رہیں گے کہ لیظھرہٗ علی الدین کلہٖ اس خدا کا اعلان ہے جسے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی شکست نہیں دے سکتی۔ مذہب تو ظلمات کی تاریکی ہے۔ اس کا مجال کیا ہے جو طلوعِ آفتاب کے راستے میں روک بن کر کھڑا ہو جائے۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

یہاں ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ دینِ مصطفوی کا مطمحِ نگاہ بے شک یہی ہے کہ تمام نوعِ انسان ایک عالمگیر برادری کے قالب میں ڈھل جائے۔ لیکن وہ بھی تو نوعِ انسان کو کافر و مومن کے دو گروہوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اس سے وحدتِ انسانیت کس طرح وجود میں آسکتی ہے؟ یہ اعتراض سطحِ بینی پر مبنی ہے۔ صحیح راستے پر چلنے والا، اگر غلط راستے پر چلنے والوں کو آوازیں دے دے کر اپنی طرف بلاتا ہے، تو یہ، مسافروں کے لئے دو الگ الگ راستے تجویز کر کے انہیں دو گروہوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ وہ غلط راستے کو مٹا کر تمام مسافروں کو ایک ہی راستے پر چلانا چاہتا ہے۔ تفریقِ انسانیت تو غلط راستوں میں ایک اور غلط راستے کے اضافہ سے ہوتی ہے۔ شراب، چرس، بھنگ، افیون کے رسیا الگ الگ گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی شخص اگر نشہ سے تائب ہو کر اپنے گروہ سے الگ ہو جاتا ہے تو اس سے وہ کوئی نیا گروہ قائم نہیں کرتا۔ وہ الگ گروہ سازی اس وقت کرتا ہے جب وہ کوئی نیا نشہ ایجاد کرے اور لوگوں کو اس کی طرف دعوت دے۔ مذاہب میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ دین کی طرف دعوت دینے والا، نشہ بازوں سے نشہ چھڑا کر، انہیں صحیح العقل انسانوں کی صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔ لہٰذا، دین، کافر و مومن کے دو الگ الگ گروہوں کی تشکیل نہیں کرتا۔ وہ مختلف گروہوں اور قوموں میں بٹے ہوئے انسانوں کو عالمگیر اجتماعِ انسانیت کی طرف دعوت دیتا ہے۔ جو اس برادری کا رکن بننا قبول کر لیتا ہے، وہ اسے مومن (یعنی مان لینے والا) کہہ کر پکارتا ہے۔ جو اس سے انکار کرتا اور اپنی الگ گروہ بندی پر قائم رہنا چاہتا ہے، اسے وہ کافر (یعنی نہ ماننے والا) قرار دیتا ہے۔ یہ انسانوں کو دو گروہوں میں بانٹنا نہیں، اسے ایک برادری میں منتقل کرنے کا عملی طریق ہے۔

عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است!

دینِ حق راہوں سے گزرتا ہوا آیا، ان میں ہم اگلی منزل میں پہنچتے ہیں جہاں قومِ عاد ہمارے سامنے آتی ہے۔ جس کی طرف حضرت ہودؑ مبعوث ہوئے تھے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ دین کی رُو سے شرفِ انسانیت کے لئے علم و عقل نہایت ضروری ہیں۔ قومِ عاد کے متعلق قرآن کریم نے بتایا ہے کہ وَجَعَلْنَا لَهُمُ سَمْعًا

وَ اَبۡصَارًا وَّ اَفۡـِٕدَةً ۔۔۔۔ (۲۶/۲۶) انہیں علم و عقل سے بہرۂ وافر عطا ہوا تھا۔ لیکن ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ اپنے علم و عقل کو کمزوروں اور محکوموں کو اپنی گرفت میں رکھنے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ ان کی حالت یہ تھی کہ وَ اِذَا بَطَشۡتُمۡ بَطَشۡتُمۡ جَبَّارِیۡنَ ۔ (۲۶/۱۳۰) وہ اپنے پنجۂ استبداد کی آہنی گرفت سے غریبوں اور مظلوموں کی ہڈیاں توڑ دیتے تھے۔ انہیں بڑی قوت حاصل تھی۔ لیکن وہ اس قوت کا استعمال حق کا بول بالا کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنی ہوسِ اقتدار کی تسکین کے لئے کرتے تھے۔ قرآن کریم کے الفاظ میں فَاسۡتَکۡبَرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ وَ قَالُوۡا مَنۡ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ وہ حق و صداقت کی خاطر نہیں بلکہ ان کے علی الرغم اپنی بڑائی چاہتے تھے۔ اور اس خیال میں مست تھے کہ ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے؟ حضرت ہودؑ ان کی طرف آئے اور ان سے کہا کہ وہ بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ علم و عقل اور جبر و قوت، نوعِ انسان کی منفعت کے لئے استعمال کرنی چاہیئے، نہ کہ انسانیت کا گلا گھونٹنے کے لئے۔ وہ قوت کے نشہ میں بدمست تھے اس لئے انہوں نے ان کی ایک نہ سنی اور ظلم و استبداد میں آگے ہی آگے بڑھتے گئے تا آنکہ غلط نظام کی تباہ کاریوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا فَمَاۤ اَغۡنٰی عَنۡهُمۡ سَمۡعُهُمۡ وَ لَاۤ اَبۡصَارُهُمۡ وَ لَاۤ اَفۡـِٕدَتُهُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِذۡ کَانُوۡا یَجۡحَدُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ حَاقَ بِهِمۡ مَّا کَانُوۡا بِهٖ یَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ۔ (۴۶/۲۶)۔ اور ان کا علم و ہنر اور عقل و بصیرت خدا کے قانونِ مکافات کے مقابلہ میں ان کے کسی کام نہ آسکے۔ دین نے اصول یہ بتایا ہے کہ اَفَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلۡمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰی سَمۡعِهٖ وَ قَلۡبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ ۔۔۔۔ (۴۵/۲۳) جو قوم اپنے جذبات اور خواہشات کو اپنے معبود بنا لے تو وہ علم و بصیرت کے باوجود تباہ ہو جاتی ہے۔ اس کے دل و دماغ پر مہریں لگ جاتی ہیں۔ اس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ تباہیاں اس کی طرف بڑھتی چلی آتی ہیں لیکن اسے کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ اپنی غلط کوششوں میں آگے ہی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ تا آنکہ تباہی کے جہنم میں جا گرتی ہے۔ آپ تاریخ انسانیت پر نگاہ ڈالئے۔ جب بھی علم و عقل، اخلاق اقدار سے بے نیاز ہوتے اور قوت و اقتدار نے اقدارِ خداوندی سے سرکشی اختیار کی، قوم تباہ ہو گئی۔ یوں تو ہر زمانے میں ایسا ہوتا چلا آیا ہے لیکن عصرِ حاضر میں اقوامِ یورپ نے جس طرح علم و عقل کو پسماندہ اقوام کے جسم کا آخری قطرۂ خون تک نچوڑنے کے لئے استعمال کیا ہے، اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی، وہاں اس حقیقت کا احساس بھی بیدار ہونے لگ گیا ہے کہ اس کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس کی تائید میں، مغرب کی اربابِ دانش و بینش کی سینکڑوں شہادات پیش کی جا سکتی ہیں لیکن اختصار کی غرض سے میں صرف دو ایک اقتباسات پر اکتفا کروں گا۔

تشکیلِ انسانیت (THE MAKING OF HUMANITY) کا نامور مصنف برفا لکھتا ہے۔

انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو، کبھی

قائم نہیں رہ سکتا خواہ اُسے کیسے ہی تدبر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ اس کی بنیادی کمزوری خارجی نظم وضبط اور اِدھر اُدھر کی جزئی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی جب تک اس کی اصل باقی ہے اس کی تباہی مقدر ہے۔ روما کی سلطنت، عام لوگوں کی لوٹ کھسوٹ سے ایک خاص طبقہ کو متمول بنانے کا ذریعہ تھی۔ انہوں نے اس "سوداگری" کو اپنی طرف سے نہایت قابلیت، تدبر اور خلوص اور دیانت سے چلایا، لیکن حسنِ انتظام کی تمام خوبیاں، بنیادی باطل کو اس کے فطری نتائج سے نہ بچا سکیں۔ غلط بنیادوں کے اثرات بلا رورعایت نتیجہ خیز ہو کر رہے۔ (ص ۱۵۹)

آگے چل کر وہ کہتا ہے۔

قوت، تہذیب، کلچر بے معنی چیزیں ہیں۔ اگر ان کے ساتھ اخلاقی برائیاں شامل ہوں۔ وہ صحیح پیمانہ جس سے انسانی دنیا کی قدر و قیمت ماپی جا سکتی ہے، اخلاقی پیمانہ ہی ہے۔ یاد رکھیئے! وہ نظامِ تہذیب جس میں حق و صداقت کو عادی طور پر نظر انداز کر دیا جائے، آخر الامر تباہ ہو کر رہتا ہے۔ (ص ۲۶۲ ر ص ۲۹۹)

آپ سوچیئے کہ اگر یہ "نورِ مصطفےٰ کی تلاش" نہیں تو اور کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ باطل نظام، مذہب کا پیدا کردہ ہوتا ہے جو یہ تعلیم دیتا ہے کہ خدا کا دائرۂ اثر و نفوذ، پرستش گاہوں تک محدود ہوتا ہے۔ ان سے باہر انسان اپنی مرضی کے مطابق جو جی میں آئے کرے۔ مذہب کو سیاست سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ دینِ مصطفوی اس کے برعکس یہ اعلان کرتا ہے کہ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ۔ تم زندگی کے جس دائرے میں بھی ہو، خدا تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ جس طرح انسان کی طبیعی زندگی کا ایک سانس بھی خدا کے قوانینِ فطرت کے دائرے سے باہر نہیں رہ سکتا، اسی طرح اس کی انسانی زندگی کا کوئی گوشہ قوانینِ مکافات کے حیطۂ اقتدار سے خارج نہیں ہو سکتا۔ قوانینِ خداوندی سے "معصیت کی سزا موت" ایک ابدی حقیقت ہے۔ دنیا اپنے ناکام تجارب کے بعد اس حقیقت کی طرف آ رہی ہے۔ اسی کا نام دینِ مصطفوی کا غلبہ ہے۔

(۸)

خدا کی زمین خدا کی مخلوق کیلئے

اب ہم اگلی منزل کی طرف آتے ہیں تو وہاں قومِ ثمود ہمارے سامنے آتی ہے۔ ان کی معیشت گلہ بانی، یعنی مویشی پروری تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کا انحصار چراگاہوں اور چشموں پر تھا۔ وہاں کیفیت یہ تھی کہ ملاء قوم نے ان چراگاہوں اور چشموں پر اپنا قبضہ کر رکھا تھا اور کمزوروں اور ناتوانوں کے مویشیوں کو ان کے قریب تک آنے کی اجازت نہ تھی۔ ارباب قوت کا دعویٰ تھا کہ وہ ان کی ذاتی ملکیت ہیں

جن میں کوئی اور دخیل نہیں ہو سکتا۔ خدا کا ایک عظیم پیغمبر (حضرت صالح) ان میں اٹھا اور ملاء قوم سے کہا کہ یہ سراسر ظلم اور دھاندلی ہے کہ تم خدا کی زمین اور اس کی پیداوار کو اپنی ذاتی ملکیت بنائے بیٹھے ہو۔ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ۔ (۷/۷۳) زمین خدا کی ہے اور مخلوق بھی خدا کی۔ خدا کی زمین، خدا کی مخلوق کے لئے یکساں طور پر کھلی رہنی چاہیئے۔ کسی کو حق حاصل نہیں کہ اس پر لکیریں کھینچ کر یہ کہہ دے کہ یہ رقبہ میرا ہے۔ اس میں کوئی دخیل نہیں ہو سکتا۔ خدا کی ملکیت کو اپنی ملکیت قرار دے لینا خدا کا شریک بن جانا ہے۔ (۲۲ : ۲) سرداران قوم نے اس انقلابی آواز کی مخالفت کرنی تھی، سو انہوں نے اس کی مخالفت کی اور سخت مخالفت لیکن حضرت ثمودؑ اپنی دعوت کو مستحکم سے مستحکم کرتے چلے گئے تاآنکہ وہ ان سے اس قسم کے معاہدہ پر مجبور ہو گئے کہ امیر غریب سب کے جانور باری باری پانی پائینگے (۵۴/۲۸)۔ لیکن وہ اس معاہدہ پر قائم نہ رہے اور پھر اسی دھاندلی پر اتر آئے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا اسے قرآن نے ایک ایسے جامع لفظ سے واضح کیا ہے جس سے حقیقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ انہوں نے قوم کو اونچے اور نیچے طبقوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ انہوں نے خدا کی بخشائشوں کے راستے میں بند لگا رکھے تھے۔ (۷/۷۴)، انہوں نے زمین پر حدیں باندھ رکھی تھیں۔ قرآن میں ہے۔ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا (۹۱/۱۴)، خدا کے قانونِ مکافات نے وہاں ایسا روڈ رولر یا بل ڈوزر چلایا کہ سب اونچ نیچ برابر کر دی۔ اور اس کے بعد ہے وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا۔ (۹۱/۱۵)، دنیا دی حکومتوں کو تو اس کا ڈر ہوتا ہے کہ بڑے بڑے لوگوں پر ہاتھ ڈالا تو نتیجہ اچھا نہیں ہوگا اس لئے وہ ان سے ڈرتے رہتے ہیں اور جرائم کے راستے میں کوئی روک نہیں رہتی۔ لیکن خدا کا قانون کسی سے نہیں ڈرتا، اس لئے اسے اس کا خوف نہیں ہوتا کہ بڑے بڑے لوگوں پر ہاتھ ڈالنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ لَا يَخَافُ عُقْبٰهَا۔ وہ اس قسم کے عواقب (CONSEQUENCES) سے قطعاً نہیں گھبراتا۔

مدین کا پیاؤ

اسی قسم کا ایک واقعہ، مدین کے پیاؤ پر (حضرت) موسےٰؑ کے سامنے بھی آیا تھا۔ وہ مصر سے بھاگ کر مدین پہنچے تو ایک پیاؤ کے قریب، درخت کے سایہ میں سستانے کے لئے بیٹھ گئے۔ سامنے کیا دیکھتے ہیں کہ چرواہے اپنی اپنی بھیڑوں کو پانی پلاتے جا رہے ہیں اور دو لڑکیاں ہیں جو اپنی بھیڑوں کو آگے نہیں بڑھنے دیتیں۔ روک رہی ہیں۔ حضرت موسےٰ کو اس پر تعجب ہوا کہ بھیڑیں شدتِ پیاس سے آگے بڑھنا چاہتی ہیں تو لڑکیاں انہیں روک کیوں رہی ہیں۔ جا کر پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ لوگ طاقتور ہیں۔ ہم دونوں لڑکیاں ہیں اور گھر میں ہمارا باپ ضعیف ہے۔ جب تک ان طاقتوروں کی بھیڑیں سیراب ہو کر چلی نہ جائیں ہم اپنی بھیڑوں کو آگے کس طرح بڑھنے دے سکتی ہیں؟ حضرت موسےٰ آگے بڑھے اور

ان لڑکیوں کی بھیڑوں کو پانی پلا دیا۔ اور پھر درخت کے نیچے آکر بیٹھ گئے اور دل میں کہا کہ مصر سے بھاگا تھا کہ وہاں ہر قسم کے ظلم و استبداد کا دور دورہ تھا۔ یہاں آیا تو وہی دھاندلی یہاں بھی ہے ــ ہر زمینے کہ رفتیم آسمان پیداست ـــ اب تو ہی بتا تیرا اسلان کدھر جائے۔ (۲۸/۲۴)

استبداد ملوکیت

مصر میں استبداد ملوکیت کا یہ عالم تھا کہ فرعون اعلانیہ کہتا تھا کہ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی۔ (۷۹/۲۴) میں تم سب کا "ان داتا" ـ پروردگار ہوں۔ وہ ملک کے باشندوں سے پوچھتا کہ بتاؤ اَلَیْسَ لِیْ مُلْکُ مِصْرَ وَ ھٰذِہِ الْاَنْھٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ۔ (۴۳/۵۱) کیا یہ ملک میرا نہیں۔ کیا اس میں بہنے والے دریا میری ملکیت نہیں! اگر یہ سب میری ملکیت ہیں تو پھر تمہارا پروردگار میرے سوا کون ہو سکتا ہے؟ اور جب تم روٹی تک کے لئے میرے محتاج ہو تو پھر تم میری غلامی اور محکومی میں کس طرح نہیں رہ سکتے! بنی اسرائیل کو اپنے پنجۂ آہنی میں گرفتار رکھنے کے لئے اس کی تکنیک یہ تھی کہ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَھُمْ۔ (۲/۴۹ وغیرہ) وہ ان کی قوم کے ایسے لوگوں کو جن میں جوہر مردانگی کی نمود ہوتی، کچل ڈالتا اور ایسے لوگوں کو آگے بڑھاتا جو ان جوہر دل سے عاری ہوتے۔ پھر اس کی سیاست یہ تھی کہ جَعَلَ اَھْلَھَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَۃً مِّنْھُمْ (۲۸/۴) وہ ان کو پارٹیوں میں تقسیم کرتا رہتا اور کبھی ایک پارٹی کو کمزور کرتا اور کبھی دوسری کو۔ اس طرح ان کی توانائیاں کشاکش باہمی کی نذر ہو جاتیں اور فرعون ان کی طرف سے مطمئن رہتا اور جس طرح جی چاہتا انہیں لوٹتا کھسوٹتا رہتا۔ کسی کو اس کی محنت کا پورا پورا ماحصل نہ ملتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کو شرفِ نبوت سے سرفراز کیا گیا ہے تو خدا نے ان سے کیا کہا تھا؟ کہا تھا کہ اَنَا اخْتَرْتُکَ فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی۔ (۲۰/۱۳) ہم نے تمہیں ایک عظیم پروگرام کے لئے منتخب کیا ہے۔ کان لگا کر سنو کہ وہ پروگرام کیا ہے؟ وہ پروگرام یہ ہے کہ۔ اِنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ اَکَادُ اُخْفِیْھَا لِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰی۔ (۲۰/۱۵) وہ انقلاب جو اب تک اندر ہی اندر کروٹیں بدل رہا تھا، وقت آگیا ہے کہ وہ ابھر کر سامنے آجائے اور اس سے ایسا معاشرہ قائم ہو جائے جس میں ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ مل جائے۔ فَلَا یَخٰفُ ظُلْمًا وَّ لَا ھَضْمًا (۲۰/۱۱۲) کسی کو اس کا خوف نہ ہو کہ کوئی اس پر ظلم کر سکیگا یا اس کی محنت کے ماحصل کو ہضم کر جائے گا۔ ظلم و استحصال پر مبنی نظام کا تختہ اسی قسم کے انقلاب کے ہاتھوں الٹتا ہے۔

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

ادھر حضرت موسیٰؑ کو مصر میں اس قسم کا انقلاب برپا کرنے کے لئے تیار کیا جا رہا تھا اور ادھر مدین میں حضرت شعیبؑ وہاں کے سرمایہ پرست سوداگروں سے کہہ رہے تھے کہ لَا تَنْقُصُوا الْمِکْیَالَ

وَ الْمِيْزَانَ (۸۴/۱۱) ماپ اور تول کے پیمانوں میں ڈنڈی مارنے کی روش سے باز آجاؤ۔ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ۔ (۸۵/۱۱) اپنے کاروباری معاملات میں عدل و انصاف کو ملحوظ رکھو۔ جو کچھ کسی سے لو اس کے برابر پورا پورا اسے دو۔ تم کاروباری بدمعاملگی سے فساد پیدا کر رہے ہو۔ اور فساد کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

یہ کاروباری استحصال کرنے والے کہیں باہر سے نہیں آئے تھے۔ اپنی ہی قوم کے سرمایہ پرست تھے۔ قارون کے متعلق قرآن نے بالتخصیص کہا ہے کہ اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ۔ (۷۶/۲۸) فرعون تو غیر قوم کا صاحبِ اقتدار تھا جو اپنی محکوم قوم (بنی اسرائیل) کو لوٹتا کھسوٹتا تھا۔ لیکن قارون خود قومِ موسےٰ کا فرد تھا جو اپنی ہی قوم کا استحصال کرتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کسی کے منہ کو انسان کا خون لگ جاتا ہے تو وہ پھر اپنوں اور بیگانوں میں کوئی تمیز نہیں کرتا۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے حضرت داؤدؑ کے ایک قصہ میں بڑے نشتر انداز سے بیان کیا ہے۔ پہلے

خون آشام بھائی

حضرت داؤدؑ سے کہا کہ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ۔ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى۔ (۲۶/۳۸) اے داؤد! ہم نے تمہیں اقتدار اس لئے سونپا ہے کہ تم حق کے ساتھ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو۔ اور اس پر اپنے رجحاناتِ قلبی کو قطعاً موثر نہ ہونے دو۔ اس تاکید کے بعد قرآن نے ایک مقدمہ کا ذکر کیا ہے جو ان کے سامنے پیش ہوا۔ اس میں مستغیث نے کہا کہ میرے فریقِ مقابل کو دیکھو! بڑا دولت مند ہے ــــ لَهٗ تِسْعٌ وَّ تِسْعُوْنَ نَعْجَةً۔ اس کے پاس ننانوے بھیڑیں اور دنبیاں ہیں۔ میں غریب آدمی ہوں۔ وَلِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ۔ میرے پاس صرف ایک دنبی ہے جس پر میں اپنا گزارہ کرتا ہوں فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا۔ اور یہ مجھے کہتا ہے کہ یہ دنبی بھی مجھے دے دے۔ تم نے اسے کیا کرنا ہے؟ چونکہ بڑا آدمی ہے اس لئے عَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ۔ مجھے بات ہی نہیں کرنے دیتا۔ دبا لیتا ہے۔ اور قیامت یہ ہے کہ یہ کوئی غیر نہیں۔ اِنَّ هٰذَآ اَخِيْ۔ (۲۳/۳۸) یہ میرا بھائی ہے۔ بھائی ہو کر مجھ سے یہ کچھ کرنا چاہتا ہے! حضرت داؤدؑ نے یہ ماجرا سنا تو اس مظلوم سے کہا کہ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ۔ یہ انتہائی ظلم ہے کہ ننانوے دنبیوں کا مالک تیرے پاس ایک دنبی بھی نہیں رہنے دینا چاہتا اور اس کے ساتھ ہی تیرا بھائی بننے کا دعوےٰ بھی کرتا ہے حضرت داؤدؑ نے یہ فیصلہ تو اس مقدمہ کا سنایا، اور اس کے ساتھ ہی کہا کہ یہ کوئی استثنائی واقعہ نہیں۔ سرمایہ پرست معاشرہ میں ہوتا ہی یہ ہے کہ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔ بڑے سرمایہ والا چھوٹے سرمایہ والے کو کھا جانا چاہتا ہے۔ کاروبار کی ابتداء تو ان کے باہمی اشتراک کے نظریہ سے ہوتی ہے۔ لیکن بڑے سرمایہ دار کی ہوسِ زر پرستی آہستہ آہستہ چھوٹے حصہ دار کا سب کچھ ہضم کر لیتی ہے۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ وَ قَلِيْلٌ مَّا هُمْ (۲۴/۳۸) اس سے صرف وہی بچ سکتے ہیں جو اقتدارِ خداوندی کی صداقت پر ایمان رکھیں اور صلاحیت بخش کام کریں۔ لیکن مشکل یہ

ہے کہ ایسے لوگ بہت کم ملتے ہیں۔

(۰)

پھر دینِ خداوندی کا یہ کاروانِ رشد و ہدایت ہمیں قومِ سبا کی طرف لے جاتا ہے۔ ان کی معیشت کا دار و مدار زراعت پر تھا۔ لہلہاتی کھیتیاں۔ پھلوں سے لدے ہوئے باغات۔ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّ رَبٌّ غَفُوْرٌ۔ (۳۴/۱۵) مرفہ الحال بستیاں اور سامانِ حفاظت۔ اس کے بعد اور کیا چاہیئے۔ لیکن ان کے دل میں ہوسِ جوعِ الارض نے انگڑائی لی۔ اور انہوں نے چاہا کہ اپنے ملک سے دور دور باہر نکل جائیں اور استعمار پسندی سے سہمانده قوموں کو لوٹنا شروع کر دیں۔ فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا۔ (۳۴/۱۹)۔ قرآن کہتا ہے کہ اس سے انہوں نے چاہا تو یہ تھا کہ دوسروں کو تباہ کر دیں لیکن ہوا یہ کہ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ۔ انہوں نے اپنے آپ کو تباہ کر لیا۔ ایسا تباہ کہ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ان کی صرف داستانیں باقی رہ گئیں۔ اور وہ بھی اس طرح منتشر کہ مَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ (۳۴/۱۹)

اٹھائے کچھ ورق لالہ نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

یہ ہیں، عزیزانِ من! انسان کی معاشی زندگی کی وہ وادیاں جن میں سے دینِ خداوندی گزر کر آگے پہنچا ہے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ پیغامبرانِ انقلابِ خداوندی نے کس طرح معاشی سلب و نہب کے ایک ایک گوشے کے خلاف جہاد کیا۔ لیکن ہوتا یہ رہا کہ یہ حضرات، سلب و نہب کے ان گوشوں کو مٹا کر جاتے، اور ان کے بعد ان کے نام لیوا، دین کو مذہب میں بدل کر، مفاد پرست گروہوں کی سرپرستی سے، پھر سے اس باطل کے نظام کا احیاء کر دیتے، اور ستم بالائے ستم کہ اسے شریعتِ خداوندی سے تعبیر کر کے عوام کو مبتلائے فریب رکھتے۔ حضور نبی اکرم نے اس نظام کے ہر گوشے کو مٹا کر اس کی جگہ دین، یعنی نظامِ خداوندی کو عملاً نافذ فرمایا۔ لیکن صدرِ اول کے تھوڑا ہی عرصہ بعد، مفاد پرست گروہوں اور مذہبی پیشواؤں کے گٹھ جوڑ سے رفتہ رفتہ پھر وہی سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام مسلط ہو گیا۔ اور اسے عین اسلام کہہ کر سندِ تقدیس عطا کر دی۔

عصرِ حاضر کے تقاضے

لیکن، عزیزانِ من! دیکھئے کہ آج دنیا میں کس قسم کا اضطراب کروٹیں بدل رہا ہے، اور کس قسم کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں! کیا یہ اضطراب اسی دین کی تلاش کا آئینہ دار نہیں۔ جو شروع سے، خدا کی طرف سے ملتا رہا اور جس کی تکمیل نبی آخر الزمان، محمد رسول اللہ کے مقدس ہاتھوں سے ہوئی۔ اور یہ آوازیں اسی کاروان کو نہیں پکار رہیں جو صبحِ ازل سے، انسانیت کو صحیح منزلِ مقصود کی طرف لے جانے کے لئے رواں دواں رہا! کیا اقوامِ عالم کی یہ تمام تڑپ اور خلش اور تگ و تاز اسی نورِ مصطفوی کی تلاش کے لئے نہیں جو ایک دفعہ وجہ تابانیٔ عالم ہوا تھا، اور جس نے آخر الامر اس کرۂ ارض کو بقعۂ نور بنانا ہے

قرآنِ کریم نے چودہ سو سال پہلے کہا تھا کہ یہ مطففین، یہ سرمایہ پرست، اس زعمِ باطل میں مبتلا ہیں کہ انہیں کوئی راستے سے ہٹا نہیں سکتا۔ یہ ان کا خیال خام ہے۔ (۸۳/۴) ایک دور آئے گا جب یہ غبار راہ کی طرح اڑ جائیں گے۔ یہ دور اس وقت آئے گا۔ یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (۸۳/۶) جب عام انسانیت خدا کی ربوبیت عالمینی کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی۔ وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّہَا۔ (۳۹/۶۹) اور زمین (ایک بار پھر) اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ یہی وہ سُحر تھی جس کی نمود کا احساس کرتے ہوئے قرآنی دیدہ ورؒ اقبالؒ نے اس صدی کے شروع میں کہہ دیا تھا کہ

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

لا سے اِلّا کی طرف

لیکن زمانہ کی بے تابیاں ابھی حصہ لا تک پہنچی ہیں۔ اس کی تگ و تاز ہنوز غلط نظام کے مٹانے تک محدود ہیں۔ صحیح نظام کس قسم کا ہونا چاہیئے اس کا دھندلا سا تصور تو اس کے سامنے آگیا ہے، لیکن اس کی مکمل شکل کیا ہوگی اور وہ استوار کن بنیادوں پر ہوگا، یہ چیز ابھی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہے یہ حقیقت بھی اسے شمعِ مصطفوی کی روشنی میں نظر آسکے گی۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ہر رسول کی دعوت کا نقطۂ آغاز یہ ہوتا تھا کہ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ۔ (۷/۵۹) تم محکومیت صرف خدا کی اختیار کرو، اطاعت صرف اس کے قوانین کی اختیار کرو۔ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ اسی کو دیگر مقامات میں ان جامع الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ۔ (۱۲/۴۰ : ۶/۵۷) حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے کسی اور کو نہیں۔ انسانوں نے اپنے بنائے ہوئے مختلف نظامہائے حکومت آزما کر دیکھ لئے ہیں۔ ان کا نتیجہ تباہیوں اور بربادیوں کے سوا کچھ نہیں نکلا۔ ان ناکام تجارب کے بعد اس کا ذہن اس طرف منتقل ہو رہا ہے کہ انسانوں کو صحیح آزادی صرف اس نظام میں حاصل ہو سکتی ہے جس میں انسانوں کے وضع کردہ قوانین نہیں بلکہ انسانوں سے بلند و بالا اتھارٹی کے عطا کردہ قوانین نافذ العمل ہوں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ اتھارٹی خدا کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ مغرب کے مفکرین کس طرح ایک ایسے ضابطہ قوانین کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں جس کا سرچشمہ فکرِ انسانی سے ماورا ہو، اس کے متعلق میں متعدد تقاریب اور خطبات میں تفصیل سے بتا اور لکھ چکا ہوں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس طلب و جستجو کے دو ایک شواہد کو بار دگر سامنے لایا جائے۔ فرانسیسی مفکر (BERTRAND DE JOUVENEL) اپنی مشہور کتاب (SOVEREIGNTY) میں لکھتا ہے کہ :-

بہ ادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اگر آپ ایک دفعہ اس اصول کو

> تسلیم کریں کہ انسانی مرضی اور ارادے کو اقتدارِ مطلق حاصل ہو سکتا ہے تو اس کے بعد جو نظامِ حکومت بھی قائم ہوں گے حقیقت کے اعتبار سے وہ سب ایک جیسے ہوں گے۔ نظامِ ملوکیت اور جمہوریت کا نظام بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن اس اصول کی رُو سے دونوں کا شعوری قالب ایک ہی ہوتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں اقتدار ہو یہ اصول اُسے یکساں حقِ مطلق العنانی عطا کر دیتا ہے۔ (ص ۱۹۹)

آپ نے دیکھا کہ اب انسانی فکر کس طرح ان تمام ادیان (نظامہائے حیات) کی نفی کرتا چلا جا رہا ہے جو فکرِ انسانی کے وضع کردہ ہیں خواہ ان کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ دیا جائے۔ اس حصہ لا کے بعد انسانی فکر جس منزلِ الّا کی تلاش میں مضطرب و بیقرار ہے اس کا تصور (دیگر مفکرین کے علاوہ) امریکی ماہرِ آئینیات ایڈورڈ کارون اپنی تصنیف (THE HIGHER LAW) میں بڑی وضاحت سے سامنے لاتا ہے۔ وہ اس میں مشہور مقنن (CICERO) کے یہ الفاظ نقل کرتا ہے کہ

> حقیقی قانون، مبنی بر حکمت اور فطرت سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ یہ فضا میں ہر جگہ پھیلا ہوا، غیر متبدل اور ابدی ہوتا ہے۔ یہ قانون معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے۔ یہ مملکت کا مقدس فریضہ ہے کہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کرے جو اس قانون کے خلاف ہو۔ اسے اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ اس میں کسی قسم کی ترمیم کرے۔ نہ ہی وہ اسے منسوخ کر سکتی ہے۔ نہ ہی ہماری پارلیمان اور نہ ہی سینٹ کو اس کا اختیار ہے کہ وہ لوگوں کو اس قانون کی قید سے آزاد کر دے۔ . . . نہ ہی اس قانون کی کیفیت یہ ہے کہ روما کے لئے الگ قانون ہو اور ایتھنز کے لئے الگ۔ ایک قانون آج ہو اور دوسرا کل۔ یہ ایک ازلی، غیر متبدل قانون ہے جو ابدی طور پر تمام اقوام کو اپنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے۔ (ص ۱)

اس قسم کے ضابطہ قوانین کی تلاش میں سرگرداں (ERNEST BARKER) ہار تھک کر سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا ہے کہ ہماری مشکل یہ ہے کہ ایسا ضابطہ حیات کہیں نہیں ملتا۔

فکرِ مغرب کی یہ بیچارگی اور بے بسی قابلِ فہم ہے۔ اس لئے کہ وہ اس ضابطہ حیات کی تلاش غلط گوشوں میں کر رہا ہے۔ اس کا مقصود اسے اس وقت مل سکے گا جب وہ آستانہ محمدیؐ پر دستک دے گا۔ وہ آستانہ اقدس جس سے نشید خداوندی کی یہ صدائے بازگشت مسلسل سنائی دیتی ہے کہ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ۔ (۴۰/۶۰) تم مجھے پکارو۔ میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا۔ اس وقت جنت سے نکلا ہوا آدم اپنے فردوسِ گم گشتہ کو پھر سے پا لے گا۔ اس وقت زمین اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ اس وقت عالم لاہوت سے یہ صدائے حیات آور اطراف کائنات سے گونجے گی۔ کہ

برخیز کہ آدم را ہنگامِ نمود آمد   ایں مشتِ غبارے را انجم بسجود آمد

اور اس وقت خدا کا یہ انقلاب آفریں اعلان ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آجائے گا کہ

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ۔ (۹/۳۳)

خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ ہدایت اور نظامِ حیات دے کر بھیجا جو یکسر حق و صداقت پر مبنی ہے۔ یہ نظام انسانوں کے خود ساختہ تمام نظامہائے زندگی پر غالب آکر رہے گا۔

دین کی رفیع الشان عمارت کا سنگِ بنیاد ہے لا الٰہ الا اللہ۔ مذہب کی دنیا میں اس عظیم نعرۂ انقلاب کا مفہوم صرف اتنا رہ گیا ہے کہ پرستش کے قابل خدا کے سوا کوئی نہیں۔ لیکن دین میں اس کا مفہوم یہ تھا کہ دنیا میں خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں جس کی محکومی اختیار کی جائے۔ ظاہر ہے کہ خدا کے اقتدار کا عملی مفہوم اس کا متعین کردہ نظامِ زندگی ہے جسے اس نے الدین کہہ کر پکارا ہے۔ اور جب اس نے کہا ہے کہ اس دین کو نازل اس لئے کیا ہے کہ یہ تمام ادیانِ عالم پر غالب آکر رہے تو اس سے مراد یہی ہے کہ انسان اپنے وضع کردہ نظاموں کو آزما کر دیکھ لے۔ وہ کبھی کامیاب ثابت نہیں ہو سکیں گے اور اسے آخرالامر اسی دین کی طرف آنا پڑے گا جسے حضور رسالتمآب نبی آخرالزمان کی وساطت سے دنیا کو دیا گیا تھا۔ یہ ایک ایسی حتمی اور یقینی بات ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیْ ... (۵۸/۲۱) خدا نے یہ لکھ رکھا ہے۔ اس کا فیصلہ کر دیا ہے کہ وہ اور اس کے رسول ہی آخرالامر غالب آئینگے۔ دوسری جگہ ہے کہ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِهٖ۔ (۱۲/۲۱) خدا کے فیصلے غالب آکر رہتے ہیں۔ لیکن انسانی دنیا میں خدا کے فیصلے انسانوں کے ہاتھوں سے بروئے کار آتے اور غالب رہتے ہیں۔ جو قوم اس مقصد کو لے کر اٹھے اس کے متعلق کہا کہ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ۔ (۴۷/۷) جب تم غلبۂ نظامِ خداوندی کے لئے اٹھے ہو تو خدا کی تائید و نصرت تمہارے ساتھ ہوگی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اِنْ یَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ۔ (۳/۱۶۰) جب خدا کی نصرت تمہارے ساتھ ہوگی تو دنیا کی کوئی قوت تم پر غالب نہیں آسکے گی۔ اس مقصد کو لے کر اٹھنے والی جماعت کو خدا نے "حزب اللہ" یعنی خدا کی پارٹی" کہہ کر پکارا اور اعلان کر دیا کہ فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغَالِبُوْنَ (۵/۵۶) خدا کی پارٹی یقیناً غالب آکر رہے گی۔

اس مقام پر میرے افقِ ذہنی پر ایک ایسے واقعہ کی یاد بیساختہ ابھر آتی ہے جو خدا کے اس عظیم اعلان کی صداقت کی زندہ شہادت ہے جب ایران کی فتح کے بعد وہاں کا نامور گورنر ہرمزان قیدی کی حیثیت سے حضرت عمرؓ کے سامنے آیا تو آپ نے اس سے کہا کہ تمہارے متعلق فیصلہ تو بعد میں کیا جائے گا میں پہلے تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ اس سے پہلے حالت یہ تھی کہ ایرانیوں کا عربوں کے ہاتھوں شکست کھا جانا تو ایک طرف تم لوگ ہم عربوں کے ساتھ جنگ کرنا بھی اپنے لئے باعثِ عار سمجھا کرتے تھے۔ اب وہی ایرانی ہیں اور وہی عرب۔ لیکن حالت یہ ہے کہ یہ عرب میدان

پر میدان مارتے چلے جا رہے ہیں، تمہارے شہر پر شہر فتح کئے جا رہے ہیں۔ انہوں نے تمہاری مملکت ختم کر دی ہے تمہارا شہنشاہ اپنی جان بچانے کے لئے مارا مارا پھر رہا ہے۔ ایسے محیر العقول انقلاب کی وجہ کیا ہے؟

سوال آپ نے سن لیا۔ اب اس کا جواب سن لیجئے۔ ہر مرتبہ آن نے کہا کہ اس کی وجہ ظاہر ہے پہلے ایک طرف ایرانی ہوتے تھے اور دوسری طرف تنہا عرب۔ ایرانیوں کا عربوں پر غالب آجانا کچھ بات ہی نہ تھی۔ لیکن اب صورت یہ ہے کہ ایک طرف ایرانی ہوتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں دوسری طرف عرب اور ان کے ساتھ ان کا رب۔ ان دو کا مقابلہ ایرانی تو ایک طرف، دنیا کی کوئی طاقت بھی نہیں کر سکتی۔ یہ تھی زندہ تاریخی شہادت خدا کے اس اعلان عظیم کی کہ اِنْ یَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ۔ (۳/۱۶۰) اگر خدا تمہارے ساتھ ہو تو دنیا کی کوئی طاقت تم پر غالب نہیں آسکے گی صدر اول کے مسلمانوں کی جنگ، عربوں اور ایرانیوں یا عربوں اور رومیوں کی جنگ نہیں ہوتی تھی۔ وہ جنگ ہوتی تھی نظام خداوندی کی مجوسی یا رومی نظام کے خلاف اور ان جنگوں میں مسلمانوں کی کامیابی۔ درحقیقت قرآنی نظام کی انسانوں کے وضع کردہ نظاموں کے خلاف کامیابی ہوتی تھی۔ قرآن کریم نے مسلمانوں کی جنگوں کی علت غائی یہ بتائی ہے کہ جَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا۔ (۹/۴۰) تاکہ خدا کا نظام غالب رہے اور باطل کا نظام مغلوب ہو جائے۔ اور اس طرح یہ حقیقت دنیا کے سامنے آجائے کہ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (۴۰/۱۲) حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے جو غلبہ و کبریائی کا حقیقی مستحق ہے۔ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ۔ (۲۳/۱۱۶) سب سے بلند وہ خدا ہے جو فوت اقتدار کا حقیقی مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ وہ عزت و اکرام کے عرش عظیم پر مستوی ہے۔ اس کا عملی مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب ایک عبد مومن خدا کے تخت جلال، اس کے عرش عظیم کے سامنے سجدہ ریز ہو کر پکارتا ہے۔ کہ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى۔ (۸۷/۱) سب سے بلند و بالا صاحب جبروت و کبریائی میرا رب ہے۔ تو اُدھر سے جواب آتا ہے کہ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳/۱۳۹) جب تم نے خدا کے غلبہ و اقتدار کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تو پھر دنیا کی کوئی طاقت تم پر غالب نہیں آسکے گی۔

رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا
اتر گیا جو ترے دل میں لَا شَرِيْكَ لَهٗ

تمہارے ہاتھوں کا متشکل کیا ہوا نظام خداوندی، دنیا کے ہر نظام پر غالب آجائے گا اور یوں خدا کا وہ وعدہ پورا ہوگا جو اس نے اپنے رسول سے ان الفاظ میں کیا تھا کہ وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ۔ (۹۴/۴) "ہم تیرے نام کو بلند کر کے رہیں گے"۔ محمدؐ کے نام کی بلندی درحقیقت اس پیغام اور نظام کی سربلندی ہے جسے دے کر حضورؐ کو بھیجا گیا تھا۔ یہ نام، پیغام اور نظام، کائنات کے ذرے ذرے میں پنہاں ہے

جوں جوں انسان کی جہالت اور مفاد پرستیوں کے پردے اٹھتے جائینگے یہ ابھر اور نکھر کر سامنے آتے چلے جائیں گے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبال نے اپنے ان وجد آفریں الفاظ میں بیان کیا تھا جنہیں میں نے اپنے اس خطاب کے آغاز میں پیش کیا تھا اور جنہیں میں اس کے اختتام پر دہرانے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں کہ یہ نام اور پیغام

دشت میں، دامنِ کہسار میں، میدان میں ہے　　بحر میں، موج کی آغوش میں، طوفان میں ہے
چین کے شہر، مراکش کے بیابان میں ہے　　اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے

چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رفعنا لک ذکرک دیکھے

والسلام

(°)

معراجِ انسانیت

سیرتِ صاحبِ قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) خود قرآن کے آئینے میں مفکرِ قرآن کا بلند پایہ شاہکار عقل و عشق، فکر و نظر، دل اور دماغ کا حسین امتزاج۔ اس سیرتِ طیبہ کے مطالعہ سے مقامِ محمدی اور انقلابِ محمدی نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

حسنِ معنوی کے ساتھ صوری پاکیزگی بھی دیدہ زیب؛ بڑی تقطیع، اعلیٰ درجہ کا سفید کاغذ، ضخامت پانصد صفحات۔ کتابت طباعت نورانی۔ جلد مضبوط اور دلکش۔

قیمت: پچیس روپے ۲۵ (علاوہ محصول ڈاک)

مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور، ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی، گلبرگ ۲ لاہور

طلوعِ اسلام کنونشن کا مقالہ

محترم حسن عباس رضوی

پاکستان کی نشأۃ ثانیہ

صدرِ مجلس و نقیبانِ قافلۂ قرآنی! سلام و رحمت

ارشادِ الٰہی ہے۔

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (۷/۱۷۶)

انہیں اِن کی داستان سناؤ تاکہ یہ سوچیں کہ ان کا مقام کیا تھا اور اب یہ کس مقام پر کھڑے ہیں۔

زمیں خاکِ درِ میخانۂ ما — فلک یک گردشِ پیمانۂ ما

حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است — جہاں دیباچۂ افسانۂ ما

اس حدیثِ سوز و ساز اور افسانۂ دل گداز کا آغاز ذرا پیچھے سے ہوتا ہے جب ہم کتابِ تخلیق کے اوراق پیچھے کی طرف لَوٹتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ آدم نے جب پہلے پہل آنکھ کھولی تو اپنے گرد و پیش ایک نگار خانۂ حیرت دیکھا۔ تا حدِ نظر وسعتِ ارض و سماوات کی ناپیدا کنار پہنائیوں میں ثمر بداماں اشجار آدم کے استقبال میں فرشِ راہ بنے ہوئے ہیں۔ ان ہوشربا مناظر کو دیکھ کر آدم ششدر رہ گیا۔ اس کی نگہِ تجسس کے سامنے پردۂ حیرت کے سوا کچھ نہ تھا۔ آواز آئی۔ آدم! یہ مقامِ استعجاب و اضطراب نہیں۔ یہ سب کچھ تمہارے قبضۂ تصرف میں ہے۔ یہاں نہ تیری کا سوال نہ میری کا۔ یہاں نہ کہیں لکیریں کھنچی ہوئی پاؤ گے نہ بند بندھے ہوئے۔ ایک حصہ سے دوسرے حصہ میں جانے کے لئے یہاں نہ تو پاسپورٹ کی ضرورت ہے نہ ویزا کی اور نہ ہی کسی اجازت نامہ (PERMIT) کی۔ جہاں جی چاہے بلا روک ٹوک جا سکتے ہو۔

وَكُلَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵)

اور جہاں سے جی چاہے سیر ہو کر کھا سکتے ہو۔

ہبوطِ آدم

آدم اس نعمتِ عظمیٰ اور خوشگوار زندگی کو پا کر بارگاہِ الٰہی میں تحمید و تحسین کے نغمے گاتا۔ بات آگے بڑھی۔ خدا نے کہا۔ آدم ہر وقت میرے نام کی مالا جپتا رہتا ہے۔ ذرا یہ تو دیکھا جائے کہ عملی طور پر اس کے دل کے اندر میرے قوانین و احکامات کے احترام کا جذبہ کس قدر موجود ہے۔ برادرانِ عزیز! آپ کے دل میں یہ خیال کروٹیں لے رہا ہو گا کہ آدم کو آزمانے کی کیا ضرورت تھی جب کہ اللہ تعالیٰ کو بحیثیت خالق آدم کی ہر کیفیت کا علم تھا۔ سوال یہ نہیں! بات دراصل یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے واقعات کو تاریخ کے اندر محفوظ کر دینا چاہتا تھا تاکہ آنے والی نسلیں اس سے عبرت حاصل کریں۔ چنانچہ آدم سے کہا۔

لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ (۳۵/۲)

دیکھو اس شجر کے قریب مت جانا ورنہ دائم مقامِ بلند سے نیچے گر جاؤ اور ان تمام نعمتوں سے محروم ہو جاؤ جو تمہیں بلا مزد و معاوضہ بخشش دی گئی ہیں۔

لیکن:

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ۔ (۲۰/۱۲۰)

اُس کے دل میں انفرادی مفاد پرستی کے سرکش جذبات نے انگڑائی لی اور وسوسۂ شیطانی اور افسونِ ابلیسی کی وجہ سے آدم نے وہی کچھ کیا جس سے اس کو منع کیا گیا تھا۔ اس نافرمانی کا نتیجہ وہی نکلا جس سے اُسے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ اور اس طرح اُسے

فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ (۲/۳۶)

اُس مقام سے نکال باہر کیا گیا جو اُسے انعام کے طور پر ملا تھا۔

بازآفرینی کی صورت

اس اخراج سے وحدت و اشتراک کی زندگی ختم ہو گئی اور نوبت سر پھٹول یعنی بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲/۳۶) تک آ پہنچی۔ یہ کیفیت دیکھ کر آدم کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ چاروں اطراف سے خطرات میں گھرا ہوا ہے اور اس کا کوئی یار و مددگار نہیں۔ وہ اس خوفِ تنہائی سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اپنے کیے پر پشیمان ہوا اور گڑگڑا کر عرض کرنے لگا۔ اے بارِ الٰہا! بازآفرینی کی کوئی صورت ہے؟ آواز آئی۔ کیوں نہیں۔ وہ صورت میں بتا دوں گا۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہاری اس حالت کا ذمہ دار کون ہے؟ آدم نے جواب دیا۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا۔ (۷/۲۳)

اے ہمارے نشو و نما دینے والے! اس انحطاط اور محرومی کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔

اور پھر التجا کی۔

وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ (۷/۲۳)

اے ہمارے نشو و نما دینے والے اگر اس وقت تیری طرف سے ہماری حفاظت اور مرحمت کا انتظام نہ ہوا تو ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

ارشاد ہوا کہ ہلاکت اور بربادی سے مصئون رہنے کی ایک ہی صورت ہو گی اور وہ یہ کہ زندگی قوانینِ الٰہیہ کے تابع بسر کی جائے۔ اس طرح پھر سے اس مقامِ بلند کا اہل ثابت کرو تو اس میں پھر واپس آ جاؤ گے۔ اس کی عملی صورت یہ ہو گی۔

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸)

میری طرف سے تمہارے پاس میری ہدایت آئے گی سو جو اس ہدایت کا اتباع کرے گا تو وہ بالکل محفوظ ہو جائے گا۔ اس کے لئے نہ کوئی بیرونی خطرہ ہو گا اور نہ کسی اندرونی خلفشار کا شائبہ۔

اس کے بعد۔

فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔ (۲/۳۷)

آدم نے قانونِ الٰہی کو زادِ راہ بنا لیا اور اسی مقام پہ لوٹ آیا جس مقام سے اس کا قدم غلط سمت کی طرف اٹھا تھا۔ اس پر اس کا نشوونما دینے والا بھی اس کی طرف لوٹ آیا اسکی رحمت کا یہی تقاضا تھا۔

قانون مکافات

اب کاروانِ انسانیت آگے بڑھا اور اس کی راہ نمائی کے لئے یہ پیمانہ مقرر کر دیا گیا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ (۲۴/۵۵)

اللہ تعالیٰ کا وعدہ (قانون) ہے کہ جو لوگ قانونِ الٰہی پر ایمان لائیں اور اس کی نگہداشت کریں اور صلاحیت بخش کام کریں۔ وہ انہیں خلافتِ ارضی عطا کر دے گا۔

اور اس کے برعکس:۔

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸)

اگر قانونِ الٰہی کی نگہداشت نہ کی گئی اور اس سے اعراض برتا گیا تو خدا کا قانونِ استبدال و استخلاف اس قوم کی جگہ دوسری قوم کو لے آئے گا۔ اور وہ قوم ایسی ہوگی جس کا تہذیب و تمدن بالکل جداگانہ ہوگا اور سابقہ قوم کی کوئی چیز اس میں نہیں ہوگی۔

یہی نہیں کہ نافرمان قوم کی جگہ دوسری قوم لے لیگی بلکہ

فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى۔ (۲۰/۱۲۴)

ایسی قوم کی اس دنیا میں معیشت تنگ ہو جائے گی اور قیامت کے دن بھی ایسی قوم کو اندھا یعنی خاسر و نامراد کھڑا کیا جائے گا۔

نافرمان قوم کا انجام

برادرانِ عزیز! تاریخ شاہد ہے کہ جس قوم نے قانونِ الٰہی کا مذاق اڑایا اور اس سے سرکشی برتی اور اس سرکشی میں بڑھتی ہی گئی تو خدا کا قانونِ مکافات اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا اور عصائے کلیمی کی ایک ہی ضرب نے اس فرعون صفت قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر رکھ دیا۔ اگرچہ ایسی قومیں۔

كَانُوْۤا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِى الْاَرْضِ۔ (۴۰/۲۱)

قوت میں بھی بڑھ چڑھ کر تھیں اور انہوں نے زمین سے پیدا ہونے والے سامانِ زیست پر کہیں زیادہ تصرف کر رکھا تھا۔

جب ظہورِ نتائج کا وقت آیا تو ایسی قومیں۔

جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ۔ (۲۱/۱۵)

کٹے ہوئے کھیت اور بجھے ہوئے انگارے کی طرح ہو گئیں۔

وَ بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّ قَصْرٍ مَّشِيْدٍ (۲۲/۴۵)

اُن کی آبادیاں ویرانوں میں تبدیل ہو گئیں۔ اُن کے کنوئیں بے کار ہو گئے۔ اُن کی آبنائیں خاکناؤں میں تبدیل ہو گئیں اور اُن کے فلک بوس محلات پیوندِ زمین ہو گئے۔

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ (۴۴/۲۹)

اُن کے اس انجام پر نہ تو آسمان کی آنکھ روئی اور نہ ہی زمین نے آنسو بہائے اور نہ ہی اُن کو مہلت دی گئی۔

وَ جَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ۔ (۳۴/۱۹)

اور تاریخ کے صفحات پر فقط ان کی داستان باقی رہ گئی۔

عذاب کی سب سے مہیب شکل

یہ بیان تھا ان قوموں کا جو صفحہ ہستی سے بالکل مٹا دی گئیں لیکن اس کے علاوہ عذاب کی اور شکلیں بھی ہیں۔ مثلاً

هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ۔ (۶/۶۵)

اللہ کا یہی قانون ہے کہ تمہارے اعمال کی سزا مختلف انداز میں وارد کرے۔ کبھی تم پر تمہیں میں سے ایسے جابر حکمران مسلط ہو جائیں جو اپنے جور و ستم سے تمہیں روند ڈالیں۔ یا کبھی معاشرہ کے عوام نظام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ اس طرح نظم و نسق کو تہ و بالا کر دیں یا تم (عوام) کو مختلف فرقوں اور گروہوں میں تقسیم کر دے جس سے یہ پارٹیاں آپس میں سر پھٹول شروع کر دیں۔ یہ ہیں باہمی جنگ و جدل اور انتشار کی وہ مختلف شکلیں جن سے معاشرہ میں فساد برپا ہو جائے اور اس طرح تم سے حکومت و سطوت چھین کر کسی اور قوم کے ہاتھ چلی جائے۔

ملک و قوم کی موت

برادرانِ عزیز! ان تینوں صورتوں میں سے سب سے مہیب صورت قوم کا انتشار DISINTEGRATION ہے۔ جب انسان کے "LIFE CELLS" جرثومۂ حیات DISINTEGRATE ہوتے ہیں تو انسان کی موت DISINTEGRATION واقع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب کسی قوم اور ملک کا شیرازہ منتشر ہوتا ہے یعنی اس کی (DIS-INTEGRATION) ہوتی ہے تو اُس قوم اور ملک کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال بنی اسرائیل کی داستان میں ملے گی جب بنی اسرائیل نے نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے قانونِ الٰہی کو پسِ پشت

ڈال دیا تو اس جرم کی پاداش میں، اللہ تعالیٰ نے انہیں اقتدار و اختیارات سے محروم کر دیا۔ اور بالآخر

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا (۷/۱۶۸)

ان کی مرکزیت ختم ہو گئی۔ اور وہ مختلف پارٹیوں میں بٹ گئے۔

حیاتِ نو

چالیس سال کی طویل مدت کے بعد بنی اسرائیل کی نئی نسل ابھری۔ انہوں نے بحکم الٰہی فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا (۲/۷۳) کے مطابق قوم کے منتشر ٹکڑوں کو باہم جوڑ کر بصورتِ ملت قانونِ الٰہی کو پھر سے تھام لیا۔ اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے لگے۔ جب اس نئی نسل میں قانونِ الٰہی کے اتباع سے مطلوبہ صلاحیت پیدا ہو گئی، اور خدا کے مقرر کردہ پیمانہ پر پوری اتری تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دوبارہ اقتدار و اختیار دے دیا۔ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى (۲/۷۳) اسی طرح خدا مردہ قوموں کو زندہ کرتا ہے اور اسی اصول کے تحت۔

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۲/۵۶)

اس قوم کو موت کے بعد دوبارہ زندگی ملی تاکہ ان کی محنت ثمربار ہو سکے۔

یہ قوم بنی اسرائیل کی نشاۃ ثانیہ تھی جس کے ساتھ انہوں نے فردوسِ گم گشتہ کو پھر سے حاصل کر لیا۔

داستانِ پاکستان

قوموں کے محو و ثبات اور تحوّل و تقلب کا یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہا اور تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہی۔ اس سلسلۂ استبدال و استخلاف کے تحت ہندوستان کے مسلمانوں کا قافلہ منزل بہ منزل چودہ اگست ۱۹۴۷ء کو ارضِ پاکستان کے اندر آن اترا۔ جیسے ہی یہ قافلہ سرزمینِ پاکستان پر لنگر انداز ہوا تو خدا کا یہ فرمان در و دیوار پر کندہ نظر آیا۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۰/۱۴)

اس خطۂ ارض کے اندر اب ہم نے تمہیں قومِ سابق کا جانشین بنایا ہے تاکہ یہ دیکھا جائے کہ تم کیا کرتے ہو۔

اب برادرانِ عزیز! ہم ایک اہم اور نازک موڑ پر آپہنچے ہیں جہاں ؎

پھر آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا
تھم اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا

تصوّرِ پاکستان

یہ مشکل مقام وہ ہے جہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے کیا کیا؟ اس سلسلہ میں آگے بڑھنے سے پہلے ہم ذرا پیچھے چلتے ہیں اور بانیِ پاکستان سے پوچھتے ہیں کہ آپ نے پاکستان کیوں مانگا تھا اور کس مقصد کے لئے حاصل کیا تھا؟ اس کی وضاحت قائد اعظم علیہ الرحمۃ نے مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور کے تاریخی اجلاس میں جس میں پاکستان کا ریزولیوشن پاس ہوا تھا اپنے خطبۂ صدارت میں اس طرح کی۔

میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی اسلام اور ہندومت کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کر رہے ہیں۔ یہ حقیقت کہ یہ دونوں مذہب نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بنا پر متحدہ قومیت ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھئے! ہندو اور مسلمان مذہب

کے ہر معاملہ میں دو جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے، یہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصورات (IDEOLOGY) پر ہیں۔

انہوں نے اس نظریہ کی مزید تشریح کرتے ہوئے نومبر ۱۹۴۵ء میں ایڈورڈ کالج پشاور میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں، ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے ہمارا دین ہمیں ایک ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہنمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطے کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

اس سے پہلے جون ۱۹۴۵ء میں فرنٹیر مسلم سٹوڈنٹس کے نام اپنے پیغام میں کہا۔

پاکستان سے مطلوب یہی نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی (IDEOLOGY) ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہمیں اپنی آزادی حاصل ہی نہیں کرنی ہمیں اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کر سکیں۔ اور اسلامی تصورات اور اصولات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

آئینِ پاکستان

اگست ۱۹۴۱ء میں قائد اعظم حیدر آباد تشریف لے گئے۔ وہاں عثمانیہ یونیورسٹی کے طالب علموں کے نظریۂ پاکستان کے متعلق اسلامی حکومت کے تصور کی امتیازی خصوصیت کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا۔

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن حکیم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

انہوں نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس ۱۹۴۳ء میں وحدتِ ملی (NATIONAL INTEGRITY) کے متعلق خود ہی سوال اٹھایا کہ

وہ کونسا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں؟ وہ کونسی چٹان ہے جس پر ملت کی عمارت استوار ہے؟ وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟

اس کے بعد خود ہی اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا۔

وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر خدا کی کتاب عظیم قرآن حکیم ہے۔ مجھے یقینِ محکم ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی

جائے گی۔ ایک خدا۔ ایک رسول۔ ایک کتاب۔ ایک امت۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! قائدِاعظم رحمۃ اللہ علیہ کے اپنے الفاظ میں پاکستان کا نظریہ اور مقصد جس کے لئے الگ آزاد مملکت کو حاصل کیا گیا۔ اور یہ ہیں اُس قانون کے خط و خال جس کو وہ پاکستان میں نافذ کرنا چاہتے تھے۔ اس طرح یہ بات بھی کسی مزید وضاحت کی محتاج نہ رہی کہ پاکستان ایک نظریاتی ریاست (IDEOLOGICAL STATE) ہے جس کی بنیاد اسلامی نظریہ حیات (ISLAMIC CONCEPT OF LIFE) بالفاظِ دیگر "ISLAMIC IDEOLOGY" پر رکھی گئی تھی اور اسلام وہ نظامِ حیات یعنی "الدین" ہے جس کے بنیادی اصول (BASIC PRINCIPLES) حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے بذریعہ وحی خدا کی طرف سے عطا ہوئے تھے۔ جو اپنی مکمل اور آخری شکل میں قرآنِ حکیم کی دفتین میں موجود ہیں۔

ہمارا رُخ کردار

اب آیئے اُس سوال کی طرف کہ ہم نے کیا کیا؟ ہم نے کیا یہ کہ جس مقصد کے لئے پاکستان حاصل کیا تھا اُس مقصد اور تصور کو کسی اور کی داستان سمجھ کر طاقِ نسیاں پر رکھ دیا جن کے پاس اقتدار تھا وہ محض اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے کوشاں رہے اور جن کے پاس اقتدار نہیں تھا وہ ہوسِ اقتدار میں دتغ تیغ وخم رہے۔ یہ قوم باہمی مخاصمت میں قلعہ بند ہوتی رہی۔ اُدھر پاکستان کی سرحدیں کمزور ہوتی چلی گئیں۔ یہ سلسلہ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء تک آ پہنچا۔ افواجِ ہندوستان کے کمانڈر انچیف جنرل چوہدری نے یہ اعلان کر دیا کہ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی شام ہم لاہور جمخانہ کلب میں بیٹھ کر فتح کی خوشی میں جام شراب نوش کریں گے۔ انہوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ پاکستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔ اُس جنگ کا نقشہ آج بھی سب کے سامنے ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل و رحمت سے پاکستان کو بچا لیا۔ اور ہمیں ایک اور موقعہ عطا کیا کہ ہم اب بھی سنبھل جائیں۔ اس واقعہ عظمیٰ کی طرف اشارہ کر کے اللہ تعالیٰ نے ہمیں بڑے مشفقانہ انداز سے کہا۔

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْۤا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ (۵/۱۱)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اللہ کے اُس احسان کو یاد کرو جب تمہاری مخالف قوم تم پر چڑھ دوڑی تھی۔ اور اُس نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ وہ تمہیں صفحۂ ہستی سے مٹا کر رکھ دیگی اور تمہارے ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گی۔ لیکن خدا نے تمہاری طرف بڑھنے والا ہاتھ کلائی سے پکڑ کر مروڑ کر رکھ دیا۔ اب ہی تم سنبھل جاؤ اور قانونِ الٰہی کی نگہداشت کرو اور اس کے مطابق اپنا نظام قائم کر لو۔ اگر تم واقعی مومن ہو تو خدا کے قانون کے علاوہ تمہیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ کیونکہ وہی تمہارا آخری اور نہ ٹوٹنے والا سہارا ہے۔

لیکن برادرانِ عزیز! ہم پھر بھی نہ سنبھلے۔ اُدھر دشمن فکر و تدبیرِ جہاد میں مصروف رہا۔ اِدھر ہم آسودہ حال ہو کر تختۂ غفلت پر سوتے رہے۔ اُدھر دشمن اپنے نظام اور مملکت کے استحکام اور بقا کے لئے سرگرمِ عمل رہا۔ اِدھر ہم ان مسائل میں ڈوبے رہے کہ پاکستان میں طرزِ حکومت آمرانہ ہو یا جمہوری۔ صدارتی ہو یا پارلیمانی۔ اور یہ بھول گئے کہ

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اس کشمکش میں اُس تصورِ حیات (IDEOLOGY) اور مقصد کے نقوش دھندلے پڑ گئے جس کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ کبھی اسلامی کا سوال اٹھا تو کبھی غیر اسلامی کا۔ کبھی دائیں طرف نگاہیں اٹھیں تو کبھی بائیں طرف کہ کونسا نظام پاکستان کے لئے موزوں رہے گا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آسکی کہ غلبہ صرف قانونِ الٰہی کے اتباع سے ہی حاصل ہوگا۔

لادینی و لاطینی کس پیچ میں الجھا تو
دارو ہے ضعیفوں کا لَا غَالِبَ اِلَّا هُوْ

اس طرح کئی تحریکیں شعلہ کی طرح اٹھیں اور دھوئیں کی طرح غائب ہو گئیں۔ ان کے پیشِ نظر صرف حصولِ اقتدار تھا۔ قانون کا احترام نہ تھا اور نہ قانون بھی وہ جو خدا کا عطا کردہ تھا۔ اس طرح وہ ہوسِ اقتدار کے جہنم صفت شعلوں میں بھسم ہو کر رہ گئیں۔ ان حقائق کو سامنے رکھئے اور اقوامِ سابقہ کی وہ داستانیں سامنے لایئے جو پہلے عرض کی جا چکی ہیں تو آپ بے ساختہ پکار اٹھیں گے کہ نام ان کا ہے داستان اپنی ہے۔ پاکستان کی تاریخ کے چوبیس سال بھی اس دھارے کا رخ نہ موڑ سکے۔ ہم نے ایک لمحہ کے لئے بھی رُک کر یہ نہ سوچا کہ ہمارے رُخِ کردار کی سمت کس طرف ہے۔ آخر وہی کچھ ہوا جس کا خدشہ تھا۔ ہمارا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ پاکستان ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور جو باقی بچ رہا اس کی وہی کیفیت ہو گئی جو قبیلِ آدم کی ہوئی تھی۔ یعنی بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲/۳۶)۔

اس سلسلہ میں خدا نے ہم سے یہ بھی کہا تھا۔

اپنے ہاتھوں تباہی

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا۔ (۱۶/۹۲)

دیکھو تمہاری حالت اس بڑھیا جیسی نہ ہو جائے جو تمام دن بمشقت سوت کاتتی رہے اور رات کو خود اپنے ہاتھوں تار تار کر کے بکھیر دے۔

چوبیس سال ہم سوت کاتتے رہے اور چوبیس سال بعد اپنے ہی ہاتھوں اُسے تار تار کر دیا۔ چوبیس سال اُمید و بیم کی ہنڈیا پکاتے رہے اور آخر کار چوراہے میں پھوڑ کر اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ یہ کیا ہم نے اس ارضِ مقدس کے ساتھ جسے بڑی حسین تمناؤں کے ساتھ حاصل کیا تھا۔ یہ حشر کیا ہم نے اُس ملک کا جسے ہم اپنے دکھوں کا مداوا سمجھتے تھے۔

مدت کے بعد اذنِ تبسم ملا بھی
وہ بھی کچھ ایسا تلخ کہ آنسو نکل پڑے

آنسو اس لئے نکل پڑے کہ ہم نے اُس قوم سے ہزیمت اٹھائی جس قوم کی تاریخ میں فتح کا لفظ تک نہیں ملتا لیکن

جس قوم کے ہاتھوں ہم نے ہزیمت اٹھائی اُس قوم کے لیڈروں کی نظر میں ہماری تباہی کے جو اسباب ہیں وہ بھی سنیئے۔ پاک بھارت مذاکرات میں بھارتی وفد کے قائد اور وزیراعظم اندرا گاندھی کے پرسنل سیکریٹری مسٹر ہکسر نے پاکستان سے واپسی کے بعد آل انڈیا ریڈیو کو ایک خصوصی انٹرویو دیتے ہوئے پاکستان کے متعلق کہا کہ

> اسلام قیامِ پاکستان کی اساس تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد فوج، سول سروس اور مملکت کے دیگر لوازمات کو مستحکم بنانے کی کوششیں کی گئیں۔ لیکن بنیادی اساس اور اس رشتہ کو جو پاکستان کے مختلف علاقوں کو متحد رکھ سکتا تھا نظر انداز کیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں پاکستان کے ٹکڑے ہو گئے۔ (عبارت ۷ اگست ۱۹۷۲ء)

بوٹا بوٹا پتہ پتہ حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

مرض اور علاج

لیکن پاکستان کا مسلمان جس نے حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا تھا وہ اپنی محنتوں کے ماحصل اور ملت کے مزرعِ شاداب کو اس طرح پامال ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔

نہیں ہے ناامید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

وہ نمی کیا ہے؟ قانونِ الٰہی کا احترام۔ اُس کی نگہداشت اور پیروی۔ لہٰذا نہ مرض نیا ہے نہ علاج نیا

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اسکا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

مرض وہی ہے جو آدم کو لاحق ہوا تھا یعنی قانونِ الٰہی سے انحراف اور علاج اس کا بھی وہی ہے جو آدم کو تجویز کیا گیا تھا فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۳۸) لیکن یہ سب کچھ انفرادی طور پر "ISOLATED" رہ کر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَةِ۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

علاج کا واحد طریقہ

ہاں یہ اس وقت ممکن ہے جب دنیا کے مسلمان جسدِ واحد کی طرح بصورتِ ملت اَلْفَتْ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ (۳/۱۰۳) کے مصداق، ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں کہ قومیں اوطان سے نہیں تصورِ حیات (IDEOLOGY) سے بنتی ہیں۔ لہٰذا مختلف علاقوں اور خطوں میں رہتے ہوئے بھی مسلمانانِ عالم ایک قوم کے افراد ہیں هٰذِهٖ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۲۱/۹۲) اس لئے کہ اَنَا رَبُّكُمْ (۲۱/۹۲) ان سب کا خدا ایک ہے۔ قوم کی تقسیم خواہ علاقائی بنیادوں پر ہو یا لسانی بنیادوں پر۔ عقیدے کی بنا پر ہو یا طبقاتی۔ بہرحال یہ ملت کی DISINTEGRATION اور مرکزِ ملت DISSOCIATION یعنی علیحدگی ہے۔

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی
ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے؟ خدائی

اس لئے وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ (۳/۱۰۳) جب تک مسلمان اِن عصبیتوں اور گروہ بندیوں سے پاک ہو کر پھر سے ملتِ واحدہ بن کر اجتماعی طور پر اپنی تگ و تاز کا محور قانونِ الٰہی کو نہیں بنا لیتے اور ایک مرکز سے وابستہ نہیں ہو جاتے ان کی نشاۃ ثانیہ اور فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں کی باز آفرینی کا راز اعتصام بالقرآن اور اس صراطِ مستقیم میں مضمر ہے جس پر محسنِ انسانیت، احمدِ مرسلؐ کے نقوشِ پا جگمگ جگمگ کرتے نظر آ رہے ہیں۔ آج سے چودہ سو سال پہلے ایک امّی قوم نے حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی سربراہی میں قانونِ الٰہی کو اپنایا اور اس کے اتباع سے وہ رفیع الشان مقام حاصل کر لیا جسے دیکھ کر قصرِ ثریا کے مکیں بھی شرمانے لگے۔

برخیز کہ آدم را ہنگامِ نمود آمد ۔۔۔ ایں مشتِ غبارے را انجم بسجود آمد

جراٴتِ رندانہ کی ضرورت

برادرانِ عزیز! وہ قانون آج بھی اپنی پوری تابناکیوں کے ساتھ قرآنِ حکیم کے اندر موجود ہے۔ آج بھی اس کے اتباع سے وہی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں جسے ماضی کی آنکھ نے دیکھا اور حال دیدہ براہ ہے۔ اس کے نفاذ کے لئے فقط جراٴتِ رندانہ اور جستِ قلندرانہ کی ضرورت ہے۔

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ ۔۔۔ کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

اگر آج بھی آپ اپنے معاملات قرآنِ حکیم کے تابع کر لیں اور ایک قوم بن کر منظرِ عام پر آئیں تو دنیا دیکھے گی کہ ستر کروڑ مسلمانوں کا سیلابِ بے پناہ کس طرح باطل قوتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ پھر پاکستان ہی کیا دنیا کی امامت آپ کے حصے میں آ جائے گی۔ اقوامِ عالم آپ کے پیش کردہ نظام کو اپنانے میں اپنی سعادت سمجھیں گی۔۔

اٹھا جو مینا بدستِ ساقی، رہی نہ کچھ تابِ ضبط باقی
تمام مے کش پکار اٹھے، یہاں سے پہلے یہاں سے پہلے

طلوعِ اسلام

برادرانِ عزیز! طلوعِ اسلام پچھلے چھبیس برس سے اس فکر کو پیش کرتا چلا آ رہا ہے وہ محض تنقید کا قائل نہیں وہ مستقل مرض کی نشاندہی کرتا چلا آ رہا ہے اور بیاضِ قرآن سے اُس کا علاج بھی پیش کرتا چلا آ رہا ہے۔ وہ ہنگامہ آرائی نہیں چاہتا۔ اُس کا نہ تو کسی سیاسی پارٹی سے تعلق ہے اور نہ کسی مذہبی فرقہ سے۔ اس کی بے لوث تگ و تاز اور سعیِ پیہم کا واحد منتہائے مقصود یہ ہے کہ

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی

(بقیہ ص ۸)

نمائش کیلئے مختلف گوشے

یہ تحریر ختم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس نمائش کے مختلف گوشوں کا ایک مختصر سا ذکر کر دیا جائے۔ ان گوشوں کی ترتیب یہ ہے۔

(۱) اقبال کی کہانی تصویروں کی زبانی۔ (۲) اقبال اور ان کا خاندان۔ (۳) اقبال کے اساتذہ۔ (۴) تو ابھی رہ گذر میں ہے قید مقام سے گزر۔ (۵) اقبال اور مسجد قرطبہ۔ (۶) غرناطہ بھی دیکھا مری آنکھوں نے لیکن — ہے دل کی تسلی نہ نظر ہیں نہ خبر ہیں۔ (۷) دو دوست علامہ اقبال اور مہاراجہ کرشن پرشاد۔ (۸) اقبال کی مرتب کردہ درسی کتب۔ (۹) تصانیفِ اقبال کے اولین ایڈیشن۔ (۱۰) اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں اعزازات۔ (۱۱) یادگار مشاعرہ۔ (۱۲) پسندیدہ شاعر اور پسندیدہ شعر۔ (۱۳) اسلامی طرز کے پسندیدہ نام۔ (۱۴) اقبال کی اردو تحریریں۔ (بہ خطِ اقبال) (۱۵) اقبال کے اردو مکاتیب (بہ خطِ اقبال)۔ (۱۶) "سلام او پیام" پر اقبال کا مکتوب (بہ خط اقبال)۔ (۱۷) اقبال کے انگریزی مکاتیب (بہ خطِ اقبال) (۱۸) اقبال کے خطوط بیگم عطیہ فیضی کے نام (بہ خط اقبال)۔ (۱۹) اقبال کی انگریزی تحریریں۔ (بہ خطِ اقبال۔ (۲۰) کلامِ اقبال (بہ خطِ اقبال) (۲۱) کلام اقبال ادبی صورت میں۔ (۲۲) تراجمِ اقبال۔ (۲۳) اقبال اور پریم چند۔ (۲۴) مفسرینِ کلامِ اقبال۔ (۲۵) لغت اور زبان کی باریکی پر اقبال کی نظر۔ (۲۶) اقبال مصوروں کی نظر میں۔ (۲۷) کلام اقبال مصوروں کی نظر میں۔ (۲۸) اقبال کے اشعار۔ خطاطی کے نمونے۔ (۲۹) چو رختِ خویش بربستم ازیں خاک۔ (اقبال کے انتقال پر رابندر ناتھ ٹیگور، سروجنی نائیڈو، جواہر لعل نہرو، سبھاش چندر بوس۔ ابوالکلام آزاد۔ سر شہاب الدین اور دوسرے زعماء کا اظہارِ غم)۔ (۳۰) متفرقات۔

ایک زیر تجویز گوشے کا عنوان جو ہم ابھی تک اس نمائش میں شامل نہیں کر سکا "موضوعاتِ اقبال" ہے۔ اسے شامل نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ یہ عنوان کئی ضمنی عنوانوں میں تقسیم ہو سکتا ہے اور اگر ہر عنوان پر تصاویر جمع کی جائیں تو صرف اسی گوشے کے لئے تصاویر کی تعداد قریب قریب اتنی ہی ہو جاتی ہے جتنی تعداد ساری نمائش کی تصویروں کی ہے۔ موجودہ صورت میں نمائش قریباً پانچسو تصاویر پر مشتمل ہے۔ "موضوعاتِ اقبال" کا گوشہ شامل کرنے سے یہ تعداد ایک ہزار تک پہنچ جاتی۔ اور اتنی بڑی نمائش کو سنبھالنا عملی اعتبار سے ایک دشوار کام ہوتا ہے۔

(ختم)

قارئین نوٹ فرمالیں

طلوع اسلام چھپنے کے لئے پریس تبدیل کیا جا رہا ہے۔ اس میں بعض اوقات کافی دقت لگ جاتی ہے۔ اگر طلوع اسلام بابت مئی، مشروع ماہ میں آپ کو نہ ملے تو ۱۵ مئی تک انتظار کرکے ہمیں اطلاع دیجئے گا۔ شکریہ!

رابطۂ باہمی

بزمہائے طلوعِ اسلام اپنی اپنی جگہ تحریک کے فروغ اور اس آواز کو ملک کے گوشہ گوشہ تک پھیلانے کے لئے سعی و کاوش کر رہی ہیں۔ ان بزموں کا سلسلہ بتدریج وسیع ہو رہا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں جھنگ صدر اور وہاڑی (ملتان) کے مقامات پر نئی بزموں کی تشکیل کے لئے مقامی وابستگانِ تحریک کی قرار دادیں موصول ہوئی ہیں۔ ادارہ ان بزموں کے قیام کی توثیق کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے نمائندگان و ارکان کے خلوص اور بلند ارادوں میں استقامت عطا فرمائے۔ منتخب شدہ نمائندگان کے اسمائے گرامی و پتے حسب ذیل ہیں۔

بزم طلوعِ اسلام جھنگ صدر نمائندہ — محترم نذیر احمد صاحب

دفتر پاپولیشن پلاننگ بورڈ۔ جھنگ

بزم طلوعِ اسلام وہاڑی نمائندہ — محترم عبدالستار صاحب۔ ایم اے۔ بی ایڈ

سینئر انگلش ٹیچر۔ میونسپل ہائی سکول۔ وہاڑی (ملتان)

کراچی میں ادارہ طلوعِ اسلام کی مطبوعات

حاصل کرنے کے لئے

دفتر بزم طلوعِ اسلام کراچی سے رابطہ قائم کریں۔

پتہ:— القائد۔ ۲۰/بی۔ ناظم آباد نمبر ۳۔ (بس سٹاپ نمبر ۷) کراچی ۱۸

لاہور میں سپیئر پارٹس کی مشہور دکان

سٹینڈرڈ آٹو موبائلز

پر تشریف لائیے!

سپیشلسٹ۔ ڈاج۔ بیڈفورڈ۔ لینڈ۔ بی۔ ایل۔ ایم سی۔ ڈیلرز۔ موٹر پارٹس۔ ٹرک۔ ٹریکٹر پارٹس۔

۱۳۵۔ بادامی باغ۔ ٹیلیفون۔ (۶۹۰۱۲) لاہور

مسلم سربراہی کانفرنس

جوں جوں مسلم سربراہی کانفرنس کے انعقاد کے دن قریب آتے جاتے تھے ہمارے دل کی دھڑکنیں تیز سے تیز تر ہوتی جاتی تھیں۔ دل کی دھڑکن کے تیز تر ہونے کی دو وجوہات ہوتی ہیں ۔۔۔ فرطِ مسرت یا کسی مزعومہ خطرہ کا اندیشہ۔ ہمارے لئے خطرہ کے اندیشہ کا احساس ، جذبۂ مسرت سے کہیں زیادہ تھا۔ ساری دنیا کی آنکھیں اس فقید المثال اجتماع پر لگی رہی تھیں مسلم اقوام کا اس طرح مل بیٹھنا ان کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ فضاؤں میں چاروں طرف ہمارے دشمن منڈلا رہے تھے۔ بیرونی ممالک تو ایک طرف خود اندرونِ ملک بھی ہمارے بدخواہوں کی کمی نہ تھی۔ آج کل جس قسم کی تخریبی کاروائیاں عام ہو رہی ہیں ان کے پیشِ نظر، ہزار احتیاطی تدابیر بھی یقینی طور پر حفاظت اور صیانت کی ضمانت نہیں دے سکتیں۔ اندریں حالات اگر خدانکردہ کوئی ایک ناشدنی واقعہ بھی ظہور پذیر ہو جاتا تو ہم کہیں کے نہ رہتے۔ وزیرِ اعظم بھٹو نے اس اجتماعِ عظیم کے انعقاد کی دعوت دے کر ذمہ داریوں کا کوہِ گراں پاکستان کے سر پر رکھ دیا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ وزیرِ اعظم بھٹو جس حسن و خوبی سے ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوئے ہیں' اس کے لئے ان کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ "ناشدنی واقعہ" تو ایک طرف' محاورہ کے الفاظ میں یوں کہئے کہ کسی ایک لقمہ میں "کرکر" تک بھی نہیں آنے پائی۔ اس سے پاکستان نے مسلم ممالک میں پھر سے وہ وقار حاصل کر لیا جو اُسے شروع میں بلا محنت و کاوش مل گیا تھا لیکن جسے بعد میں ہم نے اپنی ناعاقبت اندیشی کے ہاتھوں کھو دیا تھا۔ اللہ اس وقار کو قائم رکھے اور اس میں استحکام عطا فرمائے۔

(۲)

اب گوشۂ مسرت کی طرف آئیے۔ اس سلسلے میں دو اصولی باتوں کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ ایک چیز ہے اسلام۔ (یعنی دینِ خداوندی یا قرآنی نظامِ حیات) کا فروغ۔ اور دوسری چیز ہے موجودہ مسلمانوں کی مملکتوں کا غلبہ و اقتدار اور اقوامِ عالم کی صفوں میں ان کا باعزت مقام۔ جیسا کہ معلوم ہے' اس وقت مسلم ممالک میں کہیں بھی دینِ خداوندی قائم نہیں۔ اس لئے ان اجتماعات سے سرِ دست براہِ راست دینِ خداوندی کے فروغ کی توقعات وابستہ نہیں کی جا سکتیں' اگرچہ مستقبل میں اس کی امید رکھی جا سکتی ہے۔ طلوعِ اسلام کا مطمحِ نگاہ دینِ خداوندی (قرآنی نظام) کا قیام ہے اور اسی نصب العین کی طرف

اس کی وموت کا ہر قدم اٹھتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ موجودہ مسلمانوں کی باعزت اور پُر وقار زندگی سے خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم ان فریب دہندگان یا فریب خوردگان میں سے نہیں جن کی ذہنیت یہ ہے کہ "ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ موجودہ پیدائشی مسلمان عزت کی زندگی جیتے ہیں یا ذلت کی موت مرتے ہیں حتیٰ کہ ہمارے نزدیک اس سے بھی کچھ فرق نہیں پڑتا کہ وہ زندہ بھی رہتے ہیں یا نہیں۔" یہ مقام صرف ایک مامور من اللہ (نبی) کو حاصل ہوتا تھا کہ وہ جس قوم میں پیدا ہو، اپنے آپ کو اس سے منفرد اور الگ قرار دے۔ ہم اس مقام پر اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتے ورنہ ہم "پیدائشی مسلمانوں" سے اپنے آپ کو ارفع و اعلیٰ سمجھنے والوں سے پوچھتے کہ اگر یہ مسلمان ایسے ہی حقیر و ذلیل اور ہیچ میرز تھے تو آپ ہندوستان سے بھاگ کر ان کے ہاں پناہ لینے کے لئے کیوں آگئے تھے۔ اور پھر یہ کہ آپ کو یہاں جس قدر عیش سامانیاں میسر ہیں یہ انہی "پیدائشی مسلمانوں" کی پوزیشن کا صدقہ ہے۔ سوچئے کہ اگر یہ "پیدائشی مسلمان" یہاں کمزور اور ناتواں ہو جائیں اور بھارت کا سندھ انہیں مشرقی پنجاب کے سکھوں کے حوالے کر دے تو آپ کی کوئی شے بھی محفوظ رہ سکتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم اس فریب نفس یا انانیت کے شکار نہیں۔ ہمیں پہلے دن سے اس کا احساس رہا ہے کہ "پیدائشی مسلمان" جیسے تیسے بھی ہیں، ہم اسی شجر کی شاخیں اور برگ و بار ہیں۔ اس کی تر و تازگی ہمارے لئے وجہ زیست ہے اور اس کا خشک ہو جانا ہماری موت۔ لہٰذا کوئی اقدام جو ان پیدائشی مسلمانوں کی اجتماعی عزت اور وقار کا موجب قرار پائے، ہمارے لئے وجہ صد مسرت ہے اور اسی مسرت کا احساس تھا کہ جو ہمارے دل کی دھڑکنیں تیز تر کئے جاتا تھا۔

———— (۰) ————

دین کا فروغ اس وقت ہوگا جب مذہب اور دین کا فرق ہماری سمجھ میں آجائے گا۔ اس فرق کی ایک جھلک لاہور کی شاہی مسجد میں نماز جمعہ کے قابل صد رشک اجتماع میں صاف نظر آرہی تھی۔ ہم پاکستان ٹیلیویژن کے شکر گزار ہیں کہ اس نے کانفرنس کی کارروائی کو شنیدنی سے دیدنی کے مرتبے میں پہنچا دیا۔ شاہی مسجد کی بلند و بالا چھت کے نیچے مسلم ممالک کے سربراہ ایک ایک کر کے ہمارے لئے وجہ فروغ دیدہ ہوتے جاتے تھے جمعہ کی نماز میں فرضوں سے پہلے سنتیں پڑھی جاتی ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ ان میں سے کوئی صاحب ہاتھ چھوڑے کھڑے ہیں، کوئی ہاتھ باندھے۔ کسی نے زیر ناف ہاتھ باندھ رکھے ہیں کسی نے سینے کے اوپر۔ کوئی رکوع میں جاتے وقت رفع یدین کر رہا ہے، کوئی ویسے ہی رکوع میں جا رہا ہے۔ یہ وہ اختلاف تھا جو ہماری فرقہ بندی نے صلوٰۃ جیسے بنیادی رکن میں پیدا کر رکھا ہے اور جس کے متعلق ہر شخص ٹھنڈی سانس بھر کر کہہ دیتا ہے کہ اس اختلاف کے مٹنے کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن اس کے بعد چشم عبرت نے یہ حیرت انگیز نظارہ بھی دیکھا کہ یہ تمام نمائندگان ملت اسلامیہ ایک امام کے پیچھے صف بستہ کھڑے ہو گئے ہیں کی آواز پر سب اٹھتے۔ اس کی آواز پر سب جھکتے اور جب تک اس نے اجازت نہیں دی، کسی نے اپنے مقام سے ہلنے تک کی جرأت نہیں کی۔

ہر چند یہ مذہب کی نماز تھی لیکن اس میں بھی جب ایک امام پر اتفاق ہو گیا تو کسی نے یہ نہیں کہا کہ

ہم اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھ سکتے۔ ہمارے لئے مذہب کی دنیا میں کبھی اتنا سا اتفاق کچھ کم باعثِ مسرت نہیں تھا۔

ہم نے اسے "مذہب کی نماز" کہا ہے۔ اگر یہ نماز دین کی صلوٰۃ میں بدل جائے تو پھر اس سے مفہوم یہ لیا جائے گا کہ تمام امتِ مسلمہ ایک جماعت ہے۔ ان کا مطمحِ نگاہ یا نصب العین حیات ایک ہے (جسے قبلہ کہا جاتا ہے) یہ پوری کی پوری امت ایک مرکزیت کے تابع زندگی بسر کرتی ہے۔ اس کے لئے وہ اپنے میں سے سب سے زیادہ واجب التکریم شخصیت کو اپنا امام (سربراہ امت) منتخب کر لیتی ہے۔ پھر یہ پوری کی پوری امت، اس کے فیصلے پر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور اس کے فیصلے پر جھک جاتی ہے۔ اس کے یہ فیصلے ذاتی فیصلے نہیں ہوتے۔ کتاب خداوندی کے فیصلے ہوتے ہیں جن کا وہ خود بھی پابند ہوتا ہے اور امت کو بھی پابند کراتا ہے۔ اس امت میں وہ شخص امام ہی نہیں ہو سکتا جو خود تو صلوٰۃ ادا نہ کرے اور امت کو اس کی تلقین کرے۔ یہی نظام ساری دنیا میں پھیلی ہوئی امت کا مسلک ہوگا۔ اور اسی کی سمٹی ہوئی شکل مساجد کے اندر اجتماعِ صلوٰۃ کی شکل میں سامنے آئے گی۔ آپ نے دیکھا کہ مذہب اور دین میں کیا فرق ہے۔ اس وقت مسلمان مذہبی شعائر کی ادائیگی کے بعد مطمئن ہو جاتا ہے کہ میں نے اسلام کا فریضہ ادا کر دیا۔ جب مذہب دین میں بدل جائے گا تو (جیسا کہ ہم نے پہلے بھی لکھا تھا) فریضۂ حج کے لئے الگ اجتماع اور سیاسی امور کے لئے جداگانہ کانفرنسوں کے انعقاد کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ نہ ہی اس وقت نماز کا امام الگ ہوگا اور مرکزِ ملت کا سربراہ الگ۔

(۲)

اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے ہاں کہیں بھی ایمان کے اشتراک کو قومیت کا مدار قرار نہیں دیا گیا۔ جیسا کہ ہم گزشتہ پچیس سال سے مسلسل لکھتے چلے آ رہے ہیں، خود پاکستان میں بھی دو قومی نظریہ کو مملکت کی بنیاد قرار دینے کے دعوے کے باوجود عملاً قومیت کا معیار وطن ہی کا اشتراک ہے۔ لیکن اس "دین" سے دور افتادہ امت میں بھی 'مذہب' کا اشتراک بنائے قومیت نہیں تو کم از کم لاشعوری طور پر ہی سہی، وجۂ یگانگت ضرور بنے چلا آ رہا ہے۔ رباط کانفرنس کے انعقاد کے وقت بھی بھارت نے بہت ہاتھ پاؤں مارے کہ ان کے نمائندہ کو کانفرنس میں شرکت کی اجازت دی جائے۔ حتیٰ کہ انہوں نے اپنا وفد بھی وہاں بھیج دیا لیکن اسے اذنِ باریابی نہ دیا گیا۔ اس کانفرنس کے سلسلے میں بھی انڈیا نے بہت واویلا مچایا کہ اسے دعوتِ شرکت دی جائے لیکن کسی نے اس کی بات کا جواب تک دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اس نے التباس پیدا کرنے کے لئے یہ نکتہ بھی اٹھا دی کہ یہ کانفرنس ایشیائی ممالک کے مسائل کا حل دریافت کرنے کے لئے منعقد کی جا رہی ہے۔ اس کے عملی جواب میں دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ یہ غلط ہے۔ یہ مسلم ممالک کی کانفرنس ہے جس کا انعقاد مسلمانوں کے مسائل کا حل دریافت کرنے کے لئے عمل میں آ رہا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز کس طرح ہمارے تحت الشعور میں پیوست چلا آ رہا ہے۔

ایک اور بات بھی (خواہ وہ اتفاقیہ یا غیر شعوری طور پر ہی ظہور میں کیوں نہ آ گئی ہو) مسلمانوں کی بنیادی

یگانگت کی صداقت کا ثبوت بن کر ابھری۔ سقوطِ ڈھاکہ کے موقعہ پر اندرا گاندھی اور اس کے ہم نواؤں نے یہ کہہ کر جشنِ مسرت منایا تھا کہ اس سے دو قومی نظریہ کا ابطال ہو گیا ہے۔ ہم نے اس کے جواب میں کہا تھا کہ دو قومی نظریہ اسلام کی ایک ابدی حقیقت ہے جو ہنگامی حوادث سے باطل نہیں ہو سکتی۔ خود شیخ مجیب الرحمٰن نے بھی اس دوران میں جو رویہ اختیار کیا وہ بھی اس امر کی شہادت دیتا تھا گویا اُسے مغربی پاکستان کے مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ لیکن جب وہی مجیب اس کانفرنس میں آیا ہے تو دفورِ جذبات میں اس کی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل کر فضائے عالم میں گونج اُٹھے کہ "مجھے یہ محسوس کر کے بے حد مسرت ہو رہی ہے کہ آج میں پھر اپنے بھائیوں سے آملا ہوں"۔ سوال یہ ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن نے مغربی پاکستان کے مسلمانوں کو جو "اپنے بھائی" کہا ہے تو اس کی بنیاد کیا تھی۔ وہ مغربی پاکستان سے کٹ کر اپنی آزاد مملکت کا سربراہ بن کر آیا تھا۔ وہ ہندوؤں کی آغوش میں اور روس کے زیرِ سایہ عاطفت چلا گیا ہے لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کے ساتھ اس کا کون سا غیر شعوری رشتہ ہے جس کی وجہ سے اُس نے انہیں اپنے بھائی محسوس کیا۔ کیا یہ رشتہ مذہب ہی کا نہیں۔ اگر ایسا نہیں تو کیا اندرا گاندھی بتائے گی کہ وہ اور کونسا رشتہ ہے؟ مجیب نے خود ہی اس سوال کا جواب دے دیا تھا جب کہا تھا کہ یہ اس لئے ہے کہ "ہمارا عقیدہ مشترک ہے"۔ (نوائے وقت ۲۷ فروری ۷۲ء)

ہم دنیا بھر کے غیر مسلموں پر یہ حقیقت واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم لاکھ اسلام سے دور سہی، ہم میں ہزار خرابیاں اور برائیاں سہی، ہم کمزور سہی، ناتواں سہی، ہم میں باہمی افتراق اور اختلاف بھی سہی لیکن اس کے باوجود (انفرادی مستثنیات کو چھوڑ کر بہ ہیئت مجموعی) ہم ایک ایسے غیر محسوس رشتے کے ساتھ باہم گرہیدہ ہیں کہ جو تعلق ہمیں آپس میں ہو سکتا ہے وہ کسی دوسرے کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ اہلِ مغرب کو بہت عرصہ پہلے اس کا احساس ہو گیا تھا اس لئے ان کی ہر ممکن کوشش چلی آ رہی ہے کہ ہم ایک جگہ مل کر بیٹھنے نہ پائیں۔ لیکن انہوں نے دیکھ لیا کہ ان کی یہ مذموم آرزو کس قدر نامراد ثابت ہوئی۔ یہی خدشہ اب اندرا گاندھی کو ستا رہا ہے۔ اُسے بھی اہلِ مغرب کی طرح یہ ڈر ہے کہ کہیں مسلمانوں کے اس قسم کے مذہبی اجتماعات، دین کی بنیادوں پر وحدتِ امت کی بنیاد نہ بن جائیں۔ وہ احساس کہ جس کی بنا پر (علامہ اقبال کی مشہور نظم ابلیس کی مجلسِ شوریٰ میں) ابلیس نے کہا تھا کہ

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں — ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں — بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

یہی خوف مغرب کے مداریوں اور بھارت کے سامریوں کو کھائے جا رہا ہے۔

---

(۰)

کانفرنس نے کسی ایسے عزم کا اظہار نہیں کیا جو اس کے دین کی بنیادوں پر امتِ واحدہ کے پیکر میں ڈھل جانے کی نشاندہی کرتا، لیکن یہ حقیقت کہ اس کی تمام کارروائی میں کسی قسم کے اختلاف یا

افتراق کا شائبہ تک نظر نہیں آیا، ہمارے لئے بڑی اطمینان بخش ہے۔ ساری دنیا کے مسلمانوں کے نمائندے ایک جگہ جمع ہوں اور ان کا ہر فیصلہ کامل ہم آہنگی اور یک جہتی سے طے پا جائے، کچھ کم انقلاب نہیں!

لیکن وہ جو مائیں اپنے بچے کو نہلا دھلا کر اس کے ماتھے پر سیاہی کا ٹیکہ لگا دیا کرتی ہیں کہ اُسے کسی کی نظر بد نہ لگے تو اس کانفرنس میں بھی ایک سیاہ ٹیکہ گھس آیا تھا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ ہم نے (طلوع اسلام بابت فروری ۱۹۷۴ء) میں کہا تھا کہ کانفرنس میں افغانستان کے نمائندے کو شریک نہ کیا جائے۔ ہمارا یہ خدشہ درست نکلا۔ افغانستان نے اپنی نمائندگی کے لئے جس کو ایسے شخص کو کانفرنس میں شرکت کیلئے نامزد کیا جو پاکستان دشمنی میں بہت بے باک مشہور ہے۔ یعنی بھارت میں افغانستان کا سفیر عبدالرحمٰن پژواک۔ یہ صاحب اپنے دلی بغض کو چھپا نہ سکے اور بھری محفل میں اپنے اشتعال کو بے نقاب کر بیٹھے۔ اس مقام پر بعض نامور سربراہوں نے جس جرأت اور بے باکی اور اس کے ساتھ ہی کمال برجستگی کے ساتھ جناب پژواک کو ڈانٹا، اگر اُن کے دل میں احترام خویشی کی کوئی رمق بھی باقی ہے تو وہ اُسے عمر بھر یاد رکھیں گے۔ وزیراعظم بھٹو، اُس وقت کرسیٔ صدارت پر فائز تھے۔ بایں ہمہ انہوں نے اس انتہائی اشتعال انگیز لمحہ پر جس ضبط و تحمل کا ثبوت دیا وہ درخور صد آفرین ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں اس کانفرنس کا صدر ہی نہیں، پاکستان کے وفد کا قائد بھی ہوں اور اس حیثیت میں میں پژواک صاحب کو ترکی بہ ترکی جواب دے سکتا ہوں لیکن میں آداب میزبانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس وقت خاموش رہنا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں۔ اس جواب پر مؤتمر نے بڑی گرمجوشی کا اظہار کیا۔ لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ افغانستان کے اس نمائندہ کے دل میں پاکستان دشمنی بلکہ، عالم اسلام کے خلاف بغض و نفرت کے جذبات انتہائی گہرائیوں تک پہنچ چکے تھے۔ میزبان مملکت پاکستان نے اپنے مہمانوں کی خدمت میں الوداعی تحائف پیش کئے تو پژواک صاحب نے انہیں لینے سے انکار کر دیا۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھیے۔ کانفرنس کے ترجمان، مسٹر آغا شاہی نے بتایا کہ پروگرام کے مطابق وزرائے خارجہ کی آئندہ کانفرنس، افغانستان میں ہونی تھی لیکن انہوں نے اس سے معذوری کا اظہار کر دیا ہے اس لئے اب وہ کانفرنس ملائشیا میں ہوگی (مشرق ۲۵ فروری ۱۹۷۴ء) اس پر ہم ان حضرات کی خدمت میں اس کے سوا اور کیا عرض کر سکتے ہیں کہ

ہمیں کہ از کہہ بریدی و با کہہ پیوستی!

(۲)

کانفرنس کا افتتاح، صدر کانفرنس، مسٹر بھٹو کے استقبالیہ سے ہوا۔ اس استقبالیہ کا شمار بلا مبالغہ انگریزی ادب کے شاہ پاروں میں کیا جا سکتا ہے۔ الفاظ کیا تھے ترشے ہوئے ہیرے۔ مسٹر بھٹو کی خطابت ویسے بھی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ لیکن کانفرنس کی قابل رشک کامیابی نے ان کے ولولوں کو جس طرح بیدار اور بلند تر کر دیا تھا۔ اس کی وجہ سے ان کی اُس شام کی خطابت کا بھی انداز بڑا حسین اور رنگین تھا۔ وہ خطاب اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے چند ایک مقامات ایسے ہیں جنہیں ہم طلوع اسلام کے صفحات میں محفوظ رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کے عمومی زوال کی داستان پیش کرتے

ہوئے کہا کہ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

اس طویل دورِ انحطاط میں یوں سمجھئے کہ ہم افکار و جذبات کے اُس قید خانہ میں محبوس رہے جسے ہم نے اپنے ہاتھوں سے خود ہی تعمیر کر رکھا تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ کے متکلمین اور مقننین کی تخیل پرستی نے اسلام کے بلند و بالا نصب العین جہات کو منجمد کر کے رکھ دیا تھا۔ ذہنی جمود نے ہماری فکر کو مفلوج کر دیا تھا۔ خارجی کائنات ہمارے لئے افسردہ و پژمردہ ہو چکی تھی۔ قدامت پرستی کی تاریکیاں ہم پر مسلط ہو چکی تھیں۔ تحقیق و تجسس کی روح مر چکی تھی۔ رسومات کے پیکروں نے روح سے زیادہ اہمیت اختیار کر لی تھی۔ ہم فرقوں میں بٹ چکے تھے اور یہ فرقے ہمیشہ باہم دگر مصروفِ جنگ و پیکار رہتے تھے۔ اس انتشار و افتراق نے بیرونی یورشوں کے دروازے کھول دیئے اور ہم رفتہ رفتہ مغربی استعمار کا شکار ہو گئے۔ ۔ ۔ اس سے ہماری ثقافت کی وحدتیں بکھر گئیں۔ ہماری روایات ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں اور ہم میں ربطِ باہمی کا کوئی سلسلہ باقی نہ رہا۔ استعماری قوتوں نے ہمارے بیش بہا ورثہ کو خود ہماری نظروں میں حقیر بنا دیا۔ وہ ہمارے خزانے لوٹ کر لے گئیں اور ہمیں ہمارے ذرائع سے محروم کر دیا۔ ہمارے نونہالانِ ملت ان کے عیار مقاصد کی بھینٹ چڑھ گئے۔ بھائی بھائی سے الگ ہو گیا۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی جان کا دشمن بن گیا۔

(پاکستان ٹائمز۔ ۲۳ فروری ۱۹۷۴ء)

کس قدر صحیح تصویر ہے ہمارے انحطاط کی جو ان الفاظ میں کھینچی گئی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ قرآن مجید میں ہمیں امتِ وسطیٰ کہہ کر پکارا گیا ہے۔

اس "تعارف" میں ایک عظیم معنوی حقیقت پوشیدہ ہے جو تجزیۂ نو کی متقاضی ہے۔ صدیوں سے مشرق کو روحانیت اور تجریدی فکر کا مرکز اور مغرب کو مادیت اور استنتاجی طریقِ عمل کا گہوارہ قرار دیا جا رہا ہے۔ اسلام اس قسم کی ثنویت کو مسترد قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ روحانیت اور مادیت کی دونوں دنیائیں مسلمان کے تابع تسخیر ہیں۔ اس کا مقصود یہ ہے کہ وہ روحانیت کے ذخائر، انسانی ذات کے احترام اور دنیا بھر کی تہذیبوں کے وہ گوشے جن میں تقدس کی جھلک پائی جائے انہیں یکجا کر کے ایک نئے آدم کی تخلیق کریں۔ اس کا مقصد صرف تسخیرِ فطرت نہیں۔ اگر وہ سچے معنوں میں مسلم ہے تو وہ بیک وقت شرقی بھی ہے اور مغربی بھی۔ مادی بھی ہے اور روحانی بھی۔ صاحبِ جرأت بھی ہے اور پیکرِ عظمت و احترام بھی۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان خیالات میں کس طرح قرآنی حقائق اور اقبال کی فکر ابل ابل کر سامنے آرہی ہے۔ یہ رقصِ طاؤس یقیناً مسحور کن ہے لیکن اس کے بعد جب ہم مسٹر بھٹو کے اُن خیالات کی طرف آتے ہیں جو مغرب کی فکرگاہوں کے پروردہ ہیں تو ہمیں بے ساختہ پائے طاؤس یاد آجاتے ہیں۔ یہ وہ خیالات ہیں جن میں انہوں نے نظریۂ قومیت (نیشنلزم) کا اظہار کیا ہے۔

> اس مقام پر میرے لئے ضروری ہے کہ میں اُس خلش وا ضطراب کا ذکر کروں جو اسلام میں نظریۂ قومیت کے متعلق مسلمانوں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہے اور جس سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ یہ نظریہ مسلمانوں کے امتِ واحدہ بننے کے راستے میں حائل ہوتا ہے۔ ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ اس مسئلہ میں کچھ تذبذب سا چلا آرہا ہے۔ ہم میں عرب اور غیر عرب بہت سی قومیتیں ہیں جن کے دلوں میں تابندہ آرزوں کے ولولے موجزن ہیں۔ . . . . (ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ) نیشنلزم کسی قوم کی آزادی کے جذبۂ محرکہ کی حیثیت سے یا اُس قوم کی تشکیل اور استحکام کے ذریعہ کی حیثیت سے، یا اس کی معاشرتی اور معاشی ترقی کے محرک ہونے کی حیثیت سے بڑی طاقتور قوت ہے جسے کبھی مجروح نہیں کرنا چاہیئے۔ علاوہ ازیں نوعِ انسانی کی ثقافت کے وسیع دریا کی ایک معاون ندی کی حیثیت سے بھی نیشنلزم کا وجود ضروری ہے۔ اس طرح نیشنلزم، کسی قوم کے اپنے ملک، تاریخ، زبان، روایات کا جائزہ لینے کے بعد، دوسرے ممالک کی اندرونی زندگی اور ان کے ساتھ روابط کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے بھی نہایت ضروری عنصر ہے۔ اسلام اس قسم کے باہمی تعاون کی روح اور "ٹیکنیک" دونوں مہیا کرتا ہے۔ اس طرح "وطنیت" اور اسلام سے وفاداری دونوں کے امتزاج سے ایک بلند ہم آہنگی پیدا ہوجاتی ہے۔ ہم مسلمان اپنی اپنی قومیت کو فنا کئے یا نقصان پہنچائے بغیر نیشنلزم کے افق سے بلند جا سکتے ہیں۔ (ایضاً)

آپ دیکھتے ہیں کہ یہاں صاحبِ خطاب کس طرح مغرب کے نظریۂ قومیت سے مرعوب ہیں۔ اس مقام پر تباہیوں اور بربادیوں کے وہ خونچکاں اور انسانیت کش مناظر ایک ایک کرکے، انکے سامنے آجاتے ہیں جو مغرب میں نظریۂ قومیت کی پیداوار ہیں۔ چنانچہ اگلے فقرات میں وہ ان سب کا ذکر کرتے ہیں لیکن اس کے بعد کہتے یہ ہیں کہ ہمیں اس قسم کے نیشنلزم کو قبول نہیں کرنا چاہیئے۔ وہ شرکائے کانفرنس سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ

> ہمارا باہمی اتحاد نہایت ضروری ہے لیکن یہ اتحاد بے معنی ہوگا اگر ہم ان تباہیوں سے محفوظ رہنے کا راستہ نہ تلاش کر سکے جس سے یورپ گزشتہ چار سو سال سے جہنم زار بن رہا ہے۔ لیکن اس مسئلہ کا حل کسی ماورائے قومیت نظریہ کا تصور نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ ایسا تصور قومیت کے مثبت گوشوں کو منجمد کر دیتا ہے۔ (ایضاً)

ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس مقام پر مسٹر بھٹو نے کانفرنس کو وہ "کچدار و مریز" قسم کا مشورہ دیا۔ جو نہ صرف اسلام کے اصل و بنیاد کے خلاف ہے بلکہ اس قسم کے اجتماعات سے جو خوشگوار امیدیں وابستہ کی جا سکتی تھیں، اس سے ان پر بھی بڑی حد تک اوس پڑ گئی۔ اسلام میں مدار قومیت صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے دین کا اشتراک، جس سے خون، نسل، رنگ، اور جغرافیائی حدود سے بلند ہو کر، تمام مسلمان ایک امت بن جاتے ہیں۔ نسل یا وطنیت کی بنیادوں پر متمیّز قومیتوں کا وجود، اسلام کی اس بنیادی حقیقت کی نفی ہے۔ ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ دنیا کے مسلمان اس وقت جن مختلف اقوام میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان کا مٹا دینا ایک دن کا کام نہیں لیکن ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہم آہستہ آہستہ ان خطوط کو مٹانے کی طرف قدم اٹھائیں نہ کہ ان حلقوں کی گہرائیں اور گہرے چلے جائیں۔

نیشنلزم کی پیدا کردہ تباہیوں اور خوں ریزیوں کے اعتراف و اظہار کے بعد یہ کہنا کہ ہمیں اس قسم کی نیشنلزم اختیار نہیں کرنی چاہیئے، حقیقت پوشی کی ناکام کوشش ہے۔ نیشنلزم ایک ہی ہے۔ اس کی مختلف قسمیں نہیں۔ اگر اسے اختیار کیا جائے گا تو یہ وہی نتائج پیدا کرے گی جو اس نے یورپ میں پیدا کئے ہیں۔ اور اگر ہم ان نتائج سے بچنا چاہتے ہیں تو پھر نیشنلزم کو مردود قرار دے دینا پڑیگا۔ ہم اسے پھر دہرا دیں کہ جس طرح سوشلزم کے مختلف برانڈ نہیں، اسی طرح نیشنلزم کے بھی مختلف برانڈ نہیں۔ کفر اور اسلام دو متعین، واضح اور ایک دوسرے سے بالکل متضاد اور متبائن تصورات حیات ہیں۔ ان کے اندر الگ الگ قسمیں کوئی نہیں۔

اب ہم اس اجتماع کے "حاصل مشاعرہ" کی طرف آتے ہیں اور وہ ہے لیبیا کے سربراہ کرنل قذافی کی وہ تقریر جو انہوں نے کانفرنس کے اختتام کے دوسرے دن، قذافی سٹیڈیم لاہور کے جم غفیر کے سامنے کی۔ ہم وہ تقریر سن رہے تھے اور بے ساختہ کہہ رہے تھے کہ۔

دیدہ ام مردے درین قحط الرجال

الفاظ دل سے نکل رہے تھے اور سیدھے دلوں میں اترتے چلے جاتے تھے۔ اسلام کا غلبہ، دین کا فروغ، حق کی فتح — یہ تھا تقریر کا نقطۂ ماسکہ۔ اور پھر اظہار خیالات میں ایسی جرأت اور بے باکی جو کسی قلب مخلص ہی کے حصے میں آسکتی ہے۔ یہ تقریر بھی اخبارات میں شائع ہو چکی ہے۔ لیکن ہم اس کے کم از کم چند ایک اقتباسات سے طلوع اسلام کو محروم نہیں رکھنا چاہتے۔ انہوں نے اٹھتے ہی کہا۔

> میرے عزیز پاکستانی بھائیو! — کہ جو ہمارے عزیز ہی نہیں ہمارے بھائی بھی ہیں — میں سب سے پہلے آپ کو آپ کی برادر قوم یعنی لیبیا کے مسلمانوں کی طرف سے ہر قسم کی تائید و حمایت کا پیغام پہنچانا چاہتا ہوں۔ یاد رکھیئے: وہ فاصلہ جو ہمارے درمیان موجود ہے کوئی ایسا فاصلہ نہیں جو ہمیں آپس میں ملنے سے روک سکے۔ اس لئے کہ جب ہمارے آبا و اجداد اللہ کا پیغام پہنچانے کے لئے اٹھے تھے تو دنیا کا کوئی فاصلہ ان کے راستے میں حائل نہیں ہوا۔ لہٰذا آج بھی ہم جب

اُسی پیغام ازلی کو لے کر اٹھیں گے تو کوئی فاصلہ ہمارے راستے میں روک نہیں بن سکیگا۔ دعوتِ حق، زمان و مکان کی پابندیوں سے ماورا ہوتی ہے اور اللہ اکبر کی آواز حدود و قیود سے زیادہ طاقت ور اور دنیا کی ہر طاقت پر غالب۔ یاد رکھیئے ہم پاکستان کو ایشیا میں اسلام کا سب سے بڑا آگے بڑھنے والا قلعہ سمجھتے ہیں اور ہم سب کا یہ فریضہ ہے کہ ہم یہ پختہ فیصلہ کریں کہ اسلام کا یہ قلعہ باقی رہے گا۔ اور آگے بڑھے گا لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ اسلام صرف دعاؤں اور نمازوں کا نام نہیں۔ وہ تیاری اور طاقت کا نام ہے اور یہ ہمارے خدا کا ارشاد ہے کہ ہمیں دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ طاقت فراہم کرنی چاہیئے۔ مادی قوتیں تو ہر قوم کو حاصل ہو سکتی ہیں لیکن ایک قوت ایسی ہے جو ہمارے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکتی اور وہ ہے خدا کی تائید و نصرت جو اس قوم کے حصے میں آتی ہے جو اس کے دین کے غلبہ کے لئے اُٹھے۔ اگر دین کا غلبہ ہمارا نصب العین ہو جائے تو آپ دیکھیں گے کہ آپ کی اس سرزمین کی طرف جو بھی قدم بڑھانے کی کوشش کرے گا اس کے لئے یہ زمین جہنم کے انگارے بن جائے گی۔ ہمیں دو باتیں دنیا پر ثابت کرنی ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام کی شمشیریں آج بھی اسی طرح تیز ہیں جس طرح صدرِ اول میں تھیں اور دوسرے یہ کہ ہم مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ دین کے اس رشتہ سے پیوست ہیں جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔

(امروز - بابت ۲۶/۲ سے مقتبس)

سوچئے عزیزانِ من! کہ اس قسم کی نشید جانفزا انسان کے دل میں کس طرح جینے کی تمنا کو از سرِ نو تابندہ کر دیتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر اس کانفرنس میں اور کچھ نہ ہوتا اور صرف کرنل قذافی کی یہ تقریر ہمیں سننے کے لئے مل جاتی تو جو کچھ اس پر صرف ہوا ہے اس کے مقابلے میں یہ سودا مہنگا نہ ہوتا۔ خدا کرے کہ یہ الفاظ ہماری زندگی میں حقیقت بن کر سامنے آجائیں تو ہم آسمان سے ایک بار پھر کہہ سکیں کہ:

دیدہٗ آغا زم — انجامم نگر!

کانفرنس سے متعلق ہم سب کچھ کہہ چکے لیکن اس کے باوجود کہنے کی بات ابھی باقی ہے۔ اور وہ بات، وہ ہے جسے سننے کے لئے آپ سابقہ ماہ سے گوش بر آواز تھے یعنی بنگلہ دیش کا قضیۂ نامرضیہ۔ سابقہ اشاعت میں ہم اس مقام تک پہنچے تھے کہ کانفرنس میں شرکت کرنے والے نامور حضرات اس امر کے لئے سرنگوں و تاز ہیں کہ شیخ مجیب الرحمٰن کو کسی نہ کسی طرح کانفرنس میں شریک کر لیا جائے۔ پہلے موقف یہ تھا کہ اُدھر سے شیخ مجیب الرحمٰن پاکستان کے ۱۹۵ قیدیوں پر مقدمہ چلانے کے فیصلہ سے دست برداری کا اعلان کرے اور ادھر سے پاکستان اُسے تسلیم کر لینے کا اعلان کر دے۔ بائیس فروری کو کانفرنس کی کارروائی شروع بھی ہو گئی

لیکن ڈھاکہ اور لاہور میں وفود کی تگ و تاز کا سلسلہ جاری تھا۔ شام پانچ بجے کے قریب وزیر اعظم بھٹو نے وفاقی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کے ارکان اور کچھ دیگر حضرات کو ایک کمرے میں جمع کیا۔ محترم بھٹو جو چند ہی منٹ پہلے گل نو دمیدہ کی طرح مہک اور چہک رہے تھے جب اس کمرے میں داخل ہوتے تو وہ انتہائی افسردہ حال اور آشفتہ مُو نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے کمسر غم و تاسف میں ڈوبی ہوئی آواز میں بمشکل چند الفاظ کہے جن کا ملخص یہ تھا کہ میں جس فیصلے کا اعلان کرنے والا ہوں اُس سے میں خوش نہیں۔ لیکن بعض فیصلے انتہائی مجبوری کے عالم میں کئے جاتے ہیں۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ فیصلہ یقینی طور پر صحیح ہے۔ اس کا فیصلہ تاریخ ہی کرے گی۔ اس کے بعد انہوں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا کہ فیصلہ یہ ہے کہ ہم نے بنگلہ دیش کو بلا مشروط تسلیم کر لیا ہے۔

فیصلے کا اعلان تو اس انداز و کیفیت سے ہوا لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ سامعین نے جوش و مسرت کی تالیوں سے اس کا استقبال کیا۔ اور حیرت بالائے حیرت یہ کہ خود مسٹر بھٹو بھی ان تالیوں میں اپنے مخصوص انداز کے مطابق شریک ہو گئے۔ چشم حیراں بار بار پوچھتی تھی کہ

لے عقل چہ می گوئی ؟ اے عشق چہ فرمائی ؟

دوسری صبح، الجزائر کے صدر محترم بومدین کے مخصوص ہوائی جہاز میں شیخ مجیب الرحمٰن اپنے رفقاء کی معیت میں، لاہور کے ہوائی اڈے پر نزول فرما ہو گئے۔ وہ جہاز کی سیڑھیاں اتر رہے تھے تو اس انداز سے جیسے سکندر اعظم پورس کی سرزمین کو روندنے آ رہا ہو۔ وہ نیچے اترے تو وزیر اعظم بھٹو مع دیگر ارکانِ مملکت مستانہ وار استقبال کے لئے آگے بڑھے۔ وہ آگے بڑھنے کے لئے قدم اٹھا رہے تھے اور ہماری نگاہیں ان کی کتاب "عظیم المیہ" کے وہ ورق الٹتی جا رہی تھیں۔ جن میں لکھا تھا:۔

(۱) مجیب کے دل میں مغربی پاکستان کے لئے سخت نفرت تھی جسے وہ تصنع کے نقاب میں چھپائے رکھتا تھا۔ (ص ۱۳)

(۲) ایک آزاد بنگلہ دیش کے لئے ہندوستان کی طرف سے سازش تقسیم ہند کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھی اور اگرتلہ کیس کے بعد اس کی شدت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ (ص ۱۵)

(۳) مجیب کا منتہائے مقصود ایک آزاد بنگلہ دیش تھا۔ (ص ۵۷)

(۴) مجیب، مغربی پاکستان سے سخت نفرت کرتا تھا اور خود پاکستان کے متعلق بھی کسی فریب میں مبتلا نہیں تھا۔ (ص ۵۷)

(۵) جنگ ستمبر ۶۵ء کے بعد مشرقی پاکستان کے اُس وقت کے گورنر منعم خاں نے صدر ایوب کو رپورٹ بھیجی تھی کہ جنگ کے دوران، مجیب نے اُسے مشورہ دیا تھا کہ وہ اعلان کر دے کہ وہ آزاد بنگال کا وزیر اعظم ہے اور اس طرح مغربی پاکستان سے تعلق ختم کر لے۔ (ص ۷۶)

اس کے ساتھ ہی مسٹر بھٹو کی یہ آواز بھی ہمارے کانوں میں گونج رہی تھی جس کی رو سے انہوں نے انہی دنوں کہا تھا کہ انہوں نے اگرتلہ کیس کا فائل دیکھا ہے جس کی رو سے مجیب، واقعی بغاوت کے جرم کا مرتکب

ثابت ہوتا تھا۔

ادھر سے مسٹر بھٹو جا رہے تھے ادھر سے وہ مجیب آرہا تھا۔ جس نے پاکستان سے رہائی کے بعد ڈھاکہ سے اعلان کیا تھا کہ اگر مسٹر بھٹو سمجھتا ہے کہ میری جان بخشی کے عوض وہ میرے ساتھ کوئی تعلق قائم کرسکیگا تو وہ اس قابل ہے کہ اسے پاگل خانہ بھیج دیا جائے۔

ہم ان صداہائے بازگشت میں کھوئے تھے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آگئے اور ایسے والہانہ انداز سے مستانہ وار ایک دوسرے سے گلے ملے اور پیار و محبت کے ایسے مظاہرے کئے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بچپن کے مخلص دوست مدت کی جدائی کے بعد، اچانک ایک دوسرے کے سامنے آگئے ہیں اور وفورِ جذبات سے ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہیں اور کیا کریں۔ آغا حشر نے تو معلوم نہیں کس کیفیت کے ماتحت یہ کہا تھا، لیکن اس منظر پر ہمیں بلاساختہ ان کا یہ شعر یاد آرہا تھا کہ ؎

کسے معلوم تھا عشق اس طرح لاچار کرتا ہے
دل اُس کو جانتا ہے بے وفا اور پیار کرتا ہے

آپ اس شعر میں، عشق کی جگہ جو لفظ مناسب سمجھیں، رکھ لیں۔ ہماری سمجھ میں جو لفظ بھی آتا ہے اُس سے شعر بے وزن ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد اصل مسئلہ سامنے آتا ہے مشرقی پاکستان (نام نہاد بنگلہ دیش) کے متعلق دو برس سے مسلسل لکھتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن چونکہ اب اسے عالم ترعیدہ ہی کا ... [illegible] جلسے کے متعلق لئے ہم چاہتے ہیں کہ اپنے خیالات کو سمٹائی ہوئی شکل میں دہرا دیا جائے۔ تاکہ (کم از کم) آنے والے [illegible] کے سامنے یہ حقیقت آجائے کہ اس موضوع کے متعلق اس زاویۂ نگاہ سے بھی سوچا گیا تھا۔ ہم شروع ہی میں یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ سیکولر نظام میں ہر معاملہ کا فیصلہ وقتی مصلحتوں کے تابع ہوتا ہے، اور چونکہ پاکستان بھی اس وقت تک عملاً سیکولر مملکت ہے (اگرچہ لفظی طور پر اسے اسلامی مملکت قرار دیا گیا ہے) اس لئے اس کے فیصلے بھی سردست سیاسی مصلحتوں کے تابع ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس، دینی نظام میں زندگی کے ہر اہم معاملہ کا فیصلہ غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں کیا جاتا ہے، اور چونکہ طلوع اسلام دین کا پیغامبر ہے اس لئے وہ ان امور کا جائزہ ان اصولوں کی روشنی میں لیتا ہے۔ لہٰذا، ہماری موجودہ گفتگو کا تعلق بھی ان اصولوں سے ہوگا نہ کہ اُن سیاسی مصلحتوں سے جن کے مطابق یہ فیصلہ کیا گیا ہے۔ ویسے بھی، ہمیں ان مصلحتوں کا علم بھی نہیں۔

بنگلہ دیش کے تسلیم کئے جانے کی تائید میں ایک ہی دلیل دی جاتی ہے اور وہ یہ کہ بنگلہ دیش ایک حقیقت بن چکا ہے، اس لئے اسے تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ اس دلیل کی گہرائی تک پہنچنے کے لئے چند تمہیدی الفاظ ضروری ہیں۔

انسان کے عہد جہالت میں ایک ایسا دور آیا تھا جسے "زمانہ سحر" (MAGIC AGE) سے تعبیر

کیا جاتا ہے۔ سحر یا جادو کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ بعض الفاظ ایسے ہیں کہ ان کے معانی سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ خود اُن لفظوں کے اندر ایسی خاصیت ہوتی ہے کہ اگر انہیں کسی خاص طریقے سے دہراتے چلے جائیں تو وہ ایک خاص اثر یا نتیجہ پیدا کر دیتے ہیں۔ انسان صدیوں کی تگ و تاز کے بعد اس "زمانۂ سحر" کی طلسماتی دنیا سے آگے نکل آیا۔ لیکن وہ جو اقبال نے کہا تھا کہ

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

عصرِ حاضر کے یہ لات و منات انسان کے پیچھے لگے رہے اور اس زمانے میں انہوں نے ایک نیا بھیس بدلا جسے پراپیگنڈا کہا جاتا ہے۔ پراپیگنڈے کی ٹیکنیک یہ ہے کہ کچھ الفاظ عام کر دیئے جائیں جن کے معانی سے کچھ سروکار نہ ہو۔ لیکن انہیں اس شد و مد سے دہرایا جائے کہ وہ لوگوں کے ذہنوں کو جادو کی طرح مفلوج کر دیں اور اس طرح جو نتائج آپ پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ مرتب ہوتے چلے جائیں۔ اس دورِ تہذیب و دانش میں اس جادو سے بڑا کام لیا جا رہا ہے۔ اس دور کو "عصرِ سحر" کا عہدِ شباب کہنا چاہیئے۔

ہم نے جو اوپر کہا ہے کہ بنگلہ دیش کے تسلیم کرنے کے حق میں جو دلیل دی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ اب ایک حقیقت بن چکا ہے جسے تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ اس دلیل میں بنیادی لفظ حقیقت ہے جسے جادو کے منتر کی طرح دہرایا جا رہا ہے۔ نہ کہنے والا بتاتا ہے نہ سننے والا پوچھتا ہے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ لیکن لوگ قائل ہوتے جا رہے ہیں کہ اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ آیئے آپ کو بتائیں کہ اس لفظ کی ابتدا کہاں سے ہوئی تھی اور اس سے مراد کیا تھی۔ ہمارے دورِ ملوکیت میں مستبد حکمرانوں نے اپنے جور و استبداد کی تائید میں تقدیر کا نظریہ پیش کیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ سب کچھ خدا کے حکم سے ہوتا ہے جو پہلے سے طے شدہ ہے اس لئے انسان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں کہ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔ مشہور جرمنی فلاسفر ہیگل نے اسی نظریہ جبر کو کچھ بدلے ہوئے الفاظ میں پیش کیا۔ اس نے کہا کہ دنیا میں جو واقعہ بھی ظہور میں آتا ہے وہ "روحِ زمانہ" کی تخلیق ہوتا ہے اس لئے وہ حقیقت (REALITY) ہوتا ہے اور اس حقیقت کے تسلیم کئے بغیر انسان کیلئے کوئی چارہ نہیں۔ بالفاظِ دیگر اس کا فلسفہ یہ ہے کہ جو کچھ ہو جاتا ہے وہ حقیقت بن جاتا ہے اس لئے اس کا تسلیم کرنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ اس حقیقت کو آپ بدل نہیں سکتے (مارکس نے اسی کا نام تاریخی وجوب رکھا تھا۔ یہ جو آپ آئے دن "تاریخ کا فیصلہ" اور "تاریخ کی قوت" جیسے الفاظ سنتے رہتے ہیں، یہ انہی نظریات کی صدائے بازگشت ہے)۔ "حقیقت" کے اس تصور کے بعد نہ جائز و ناجائز کو پرکھنے کے لئے کوئی غیر متبدل اصول رہے، نہ صحیح اور غلط کے ماپنے کا کوئی مستقل پیمانہ۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ یورپ میں مستقل اخلاقی اقدار کی دھجیاں بکھر گئیں اور جنگل کا قانون، معاشرہ کا معمول بن گیا۔ یہی قانون دنیا میں ہر جگہ سیکولر نظام کی بنیاد ہے۔

اس پس منظر کی روشنی میں بنگلہ دیش کی "حقیقت" پر نگاہ ڈالیئے۔ مشرقی پاکستان، مملکتِ پاکستان کا ایک صوبہ تھا۔ وہاں ایک فرد یا گروہ نے مملکت سے غداری کی اور بغاوت کے لئے اُٹھ کھڑے

ہوئے۔ پاکستان دشمن قوتوں کی امداد سے یہ بغاوت کامیاب ہوگئی۔ اس گروہ نے پاکستان سے کٹ کر اپنی آزاد مملکت کا اعلان کر دیا۔ اس واقعہ پر دو برس سے زاید عرصہ گزر چکا ہے۔

کہا یہ جاتا ہے کہ بتاؤ جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ امرِ واقعہ ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ امرِ واقعہ ہے۔ اس سوال کا جواب مثبت میں ملتے جانے کے بعد کہا جاتا ہے کہ جب یہ امرِ واقعہ ایک حقیقت بن چکا ہے۔ یعنی ظہور میں آچکا ہے اور اب تک موجود ہے تو پھر اسے تسلیم کرنے میں کیا باک ہو سکتا ہے؟ آپ نے غور کیا کہ جہاں تک لفظی گورکھ دھندے کا تعلق ہے یہ دلیل کس قدر مسحور کن اور فریب انگیز ہے۔ سوال یہ نہیں کہ بنگلہ دیش ایک آزاد مملکت کی حیثیت میں موجود ہے یا نہیں، اس کی موجودگی سے تو کوئی اندھا بھی انکار نہیں کر سکتا۔ سوال یہ ہے کہ جو کچھ ہوا ہے کیا وہ حق کے مطابق تھا؟ یعنی سوال بنگلہ دیش کی موجودگی یا عدم موجودگی کا نہیں۔ سوال اس مملکت کے برحق یا ناحق ہونے کا ہے۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ کیا کوئی شخص چھاتی پر ہاتھ رکھ کر یہ کہہ سکتا ہے کہ جس طرح اس مملکت کو وجود میں لایا گیا ہے وہ برحق تھا۔ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ وہاں ہوا ہے اسے برحق تسلیم کر لیا گیا ہے اور یہی ہمارا نقطۂ اختلاف ہے۔ ہمارے نزدیک وہ مملکت یکسر ناحق طریق پر وجود میں لائی گئی۔ اور اگر وہ دو برس تو ایک طرف، دو ہزار سال تک بھی قائم رہے تو بھی اس کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ عدل واخلاق کے اصولوں کی رو سے اس کا ظہور بھی مبنی برحق نہیں تھا اور اس کا وجود بھی مبنی برحق نہیں۔ اسے ایک روزمرہ کی مثال سے سمجھئے۔ ایک زورآور کسی کمزور آدمی کے قطعہ زمین پر زبردستی قابض ہو جاتا ہے۔ کچھ وقت کے بعد اس پر اپنا مکان بھی تعمیر کر لیتا ہے۔ اسے اس میں رہتے سہتے برسوں گزر جاتے ہیں اور اس کمزور انسان کی کوئی کوشش اسے بے دخل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ اس قطعہ زمین پر اس شخص کا قبضہ ایک حقیقت ہے جسے ہر شخص محسوس پر دیکھتا ہے۔ لیکن کیا اس کمزور آدمی سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ چونکہ اس زمین پر اس غاصب کا قبضہ حقیقت بن چکا ہے اس لئے تم بھی اسے تسلیم کر لو۔ یعنی اسے تسلیم کر لو کہ اس نے جو کچھ کیا ہے، وہ جائز اور حق پر مبنی تھا۔

اس سے نیچے اتر کر اب اس عظیم اجتماع کی طرف آیئے جس کا تذکرہ چلا آ رہا ہے۔ ذرا سوچئے کہ ان قریب چالیس سربراہانِ مملکت کے سر جوڑ کر بیٹھنے کا مقصد کیا تھا؟ یہ بات غور سے سمجھنے کی ہے۔ کوئی پچیس تیس سال کا عرصہ ہوا، یہودیوں نے عربوں کے ایک خطۂ زمین پر غاصبانہ قبضہ کر لیا — یا یوں کہیئے کہ ذی اقتدار قوتوں نے ان سے یہ قبضہ کروا دیا۔ انہوں نے اس ملک میں اپنی مملکت قائم کر لی۔ یہ وہ مملکت ہے جس کے وجود سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ یعنی یہ ایک حقیقت بن چکی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ سربراہانِ مملکت اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ وہاں اس نام کی کوئی مملکت نہیں۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ اس مملکت کا وجود حق پر مبنی نہیں اس لئے ہم اسے تسلیم نہیں کریں گے اور اس سرزمین کو ان کے ناجائز قبضے سے واگذار کرا کے رہیں گے۔ اور تو اور خود پاکستان نے بھی اسرائیلی مملکت کو ابھی تک تسلیم نہیں کیا۔

اسرائیل نے پہلے ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اور پھر ۱۹۷۳ء کی جنگ میں عربوں کے کچھ علاقوں کو فتح کر لیا۔ اور اس طرح ان پر قابض ہو گئے۔ یہ واقعہ کہ اسرائیل نے ان علاقوں کو فتح کیا تھا اور اب وہ ان پر قابض ہے، ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن مسلم ممالک کہتے ہیں کہ ہم اسرائیل کے اس قبضے کو برحق یا جائز تسلیم نہیں کرتے۔ اس لئے ان علاقوں کو اسرائیل سے واگذار کرا کے دم لیں گے۔

اِدھر اپنے گھر کی طرف آیئے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ وادیٔ کشمیر کے ایک حصے پر بھارت کا قبضہ ہے۔ ان کے اس قبضہ سے ہمیں بھی انکار نہیں لیکن اس کے باوجود ہم اُن کے اس قبضے کو تسلیم نہیں کرتے۔ ہم کیا تسلیم نہیں کرتے؟ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ بھارت کا یہ قبضہ حق اور انصاف کے مطابق ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں کیا یہ امر حیرت انگیز نہیں کہ اس اجتماعِ عظیم میں اس فیصلے کا اعلان ہو کہ اُن کی میزبان مملکتِ پاکستان کے ایک حصے پر، مملکت کے باغیوں نے جو زبردستی قبضہ کر رکھا ہے وہ مبنی برحق ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے منطقی نتیجہ کی رُو سے یہ بھی کہ بھارت یا کسی اور بیرونی قوت نے اس باب میں جو جارحیت کی تھی وہ بھی بالکل جائز اور حق کے مطابق تھی۔ بنگلہ دیش کے تسلیم کرنے کے یہی معنی ہیں۔ وقتی کمزوری اور بے بسی کی بنا پر ظلم و ستم کو برداشت کرنا کوئی جرم نہیں لیکن ظلم و ستم کو مبنی برحق تسلیم کر لینا ایسا جرم ہے کہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے جس کے نتائج اور عواقب کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ قطع نظر دیگر امور، اس نظیر (PRECEDENT) کی روشنی میں اگر آج کوئی طاقت مسلم سربراہوں سے پوچھے کہ آپ اسرائیل کے معاملے میں اسی طرح اس حقیقت کو تسلیم کیوں نہیں کر لیتے جس طرح آپ نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا ہے۔ یا پاکستان سے پوچھے کہ اسی فیصلے کے مطابق تم کشمیر پر بھارت کے قبضے کو تسلیم کیوں نہیں کر لیتے، تو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ہم اس کا جواب کیا دے سکیں گے۔ اس کے بعد یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ خود مملکتِ پاکستان کے موجودہ حصے میں اس فیصلے کا ردِعمل کیا ہوگا اور کون کون سی حقیقتوں کو ابھارا جائے گا۔ ان مطالبوں کا سنگِ بنیاد تو افغانستان کے نمائندہ، عبدالرحمٰن پژواک نے خود کانفرنس کے بھرے اجلاس میں رکھ دیا تھا جب اُس نے اس فیصلہ کا ذکر کرنے کے بعد کہا تھا کہ ہمیں امید ہے کہ اب پاکستان اسی طرح باقی حقیقتوں کو بھی تسلیم کر لے گا۔ اُسے وہاں بے شک ڈانٹ دیا گیا لیکن اس سے وہ فتنے تو نہیں دب سکتے جن کے امکانات اس فیصلہ کے اندر مضمر ہیں۔

ضمناً، ہم سے تو چین ہی اچھا ثابت ہوا جس نے کہا ہے کہ پاکستان نے اگر بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا ہے تو اس سے بھی ہمارے موقف پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ ہم بنگلہ دیش کے اقوام متحدہ میں داخلہ کی اب بھی مخالفت کریں گے۔ یہ اس لئے کہ ہماری مخالفت ایک اصول پر مبنی ہے۔ اور وہ اصول یہ ہے کہ کسی ایسی مملکت کو اقوامِ متحدہ کی رکنیت کا حق حاصل نہیں ہو سکتا جو اس ادارہ کی قرار دادوں کا احترام نہیں کرتی اور جنیوا کنونشن کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتی جب تک بنگلہ دیش اپنی اسی ہٹ پر قائم رہیگا

ہم اس کی مخالفت کرتے رہیں گے۔ جبکہ کے اس اصول پرستانہ مسلک پر جہاں ایک طرف ہماری زبان پر بے ساختہ تحسین و تبریک کے کلمات آجاتے ہیں، وہاں دوسری طرف ہم اس احساس سے عرقِ ندامت میں ڈوب جاتے ہیں کہ ہمارا دعوےٰ یہ ہے کہ دنیا کو اصول پرستی کا سبق ہم نے سکھایا اور اب اصول پرستی کا سبق ہمیں کون سی قومیں سکھا رہی ہیں!

(٥)

بہرحال! جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا ہے، ہمارا یہ اختلاف اصولی نوعیت کا ہے ہم عملی سیاسیات میں حصہ نہیں لیتے۔ اس لئے ہمارا یہ اختلاف فکری حد تک ہی رہ سکتا ہے۔ لیکن یہاں ایسے عناصر موجود ہیں جو عوام کے جذبات کو مشتعل کر کے ملک میں ہنگامے برپا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم اس قسم کی اشتعال انگیزیوں اور ہنگامہ خیزیوں کے شروع سے خلاف چلے آ رہے ہیں اور اب بھی شدت سے ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس قسم کے فیصلے درحقیقت "بلا حدود جمہوری نظام کا نتیجہ ہیں"۔ اور جب آپ اس ملک میں اس نظام کو قبول، اختیار اور رائج کر چکے ہیں تو پھر آپ کو اس کا خمیازہ بھگتنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ ان فیصلوں کے بدلنے اور ان کے پیدا کردہ نتائج کے ازالہ کے لئے آپ کے اپنے مسلک کی رُو سے، جمہوری طریق کے سوا کوئی اور طریق جائز نہیں قرار پا سکے گا۔ ان مشکلات کا حقیقی علاج تو قرآنی نظام ہے۔ لیکن تم اس سے آپ اسی طرح ڈرتے ہیں جس طرح جنودِ ہامان کی رسیاں، عصائے موسیٰ سے لرزاں و ترساں تھیں۔ ہمیں سمجھا کر، تاریکی کے خلاف واویلا مچانا، اپنا مذاق آپ اڑانا نہیں تو اور کیا ہے؟

ایک اور چراغ گُل ہو گیا

ابھی ابھی کراچی سے یہ جانکاہ خبر موصول ہوئی ہے کہ ملک کے نامور محققِ تاریخ (مولانا) محمود احمد عباسی کا انتقال ہو گیا۔ ان کی وفات سے ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا پُر کرنے والا ابھی کوئی اور نظر نہیں آتا۔ تاریخ کی تنقید و تنقیح ان کا خصوصی موضوع تھا۔

انہوں نے اس سلسلہ میں کئی ایک تصانیف شائع کیں لیکن ہمارے نزدیک ان کا سب سے بڑا کارنامہ وہ تھا جس سے انہوں نے مودودی صاحب کے بُت کو توڑا تھا۔ مودودی صاحب نے ہماری نژادِ نو کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے جو مہم جاری کر رکھی ہے اس کی ایک مذموم کڑی ان کی رسوائے عالم کتاب "خلافت و ملوکیت" ہے جس میں انہوں نے صدرِ اول کی بعض نہایت برگزیدہ شخصیتوں کی سیرت کو بڑا داغدار کر کے پیش کیا ہے۔ عباسی صاحب مرحوم نے اپنی معرکہ آرا تصنیف "حقیقتِ خلافت و ملوکیت" میں اس کا ایسا مدلل اور مسکت جواب لکھا جس سے خود مودودی صاحب کی حقیقت واشگاف طور پر سامنے آ گئی۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے سحابِ کرم سے نوازے اور ان کے پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

مقام مسرت ہے کہ

پاکستان میں عربی زبان سیکھنے کی اہمیت نمایاں اور اس کی طرف رجحان بیدار ہو رہا ہے۔ لیکن اس راستے کی مشکلات ہر شخص کو پریشان کر رہی ہیں۔ ایک تو ہمارے قدیم طریقے کے مطابق عربی سیکھنے کے لئے ایک عمر درکار ہوتی ہے اور دوسرے یہ شوق اُن لوگوں میں بھی بیدار ہو رہا ہے جو زندگی کے کاروبار میں مصروف ہیں۔ ادارہ طلوع اسلام نے ان مشکلات کا حل بہت پہلے سے دریافت کر لیا تھا۔ اس نے جدید طریق کے مطابق ایک کتاب مرتب کی اور عملاً یہ دیکھا کہ اس کے مطابق بیس یا تیس نشستوں میں عربی زبان میں اتنی استعداد پیدا ہو جاتی ہے جس سے قرآن مجید سمجھ میں آنے لگ جاتا ہے۔ اس کتاب کا نام ہے ـــــــــــــــ

عربی خود سیکھیے

اس کے دو ایڈیشن ایک قلیل عرصہ میں ختم ہو گئے اور اب تیسرا ایڈیشن بھی دھڑا دھڑ بک رہا ہے۔ خود عربی سیکھنے کے لئے اس سے زیادہ آسان اور سائنٹفک کتاب اردو زبان میں کوئی اور نہیں ملے گی۔ اسے جلد منگا لیجیئے تاکہ آپ کو اگلے ایڈیشن تک انتظار نہ کرنا پڑے۔

قیمت:۔ -/۶ روپے۔ (محصولڈاک ایک روپیہ الگ)

(ملنے کا پتہ)

(۱) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور (۲) ادارہ طلوع اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور